سابقہ کام کا جائزہ:

اسلام کا تصورِ اہلیت، کے عنوان کے تحت کوئی باقاعدہ طور پر کام نظر سے نہیں گزرا البتہ سورۃ النساء آیت نمبر:58 کے تحت اردو عربی تفاسیر، کتبِ احادیث اور اسلامی سیاست اور امورِ مملکت کے تحت لکھی گئی کتابوں میں اس عنوان کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ہم نے اپنے اس مضمون میں قرآنی آیات، حدیثی روایات اور علماء کے ایسے اقوال کو نقل کیا جو اس مضمون سے تعلق رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی ہم نے معاشرے میں رونما ہونے والی بے قاعدگیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔

صلاحیت کا تصور:

ریاست کی باگ ڈور ایسے افراد کی ذمہ داری ہوتی ہے جو نبی یا نبی جیسی بعض صفات کے متحمل ہوں۔ مثلاً صلوٰۃ و زکوٰۃ کو قائم کرنا نبی کی صفت ہے۔ ایک مسلم حاکم کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کو قائم کرے۔ جیسا کہ ایک مقام پر ارشاد ہوا:

الَّـذِينَ إِن مَّكَّنَّاهمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّه عَاقِبَة الْأُمُورِ۔4 '

'اور جب ہم انہیں زمین کی باگ ڈور دیتے ہیں تو یہ نظامِ صلوٰۃ وزکوٰۃ قائم کرتے ہیں۔ اور نیکی کا حکم کرتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں اور تمام امور اللہ کے اختیار میں ہے۔"

انبیاء کرام جیسی صفات کے حامل افراد جو اللہ رب العلمین کی حاکمیت کو بذریعہ کتاب اللہ قائم کرتے ہیں۔ اس کی نظیر و تعلیم ہمیں قرآن مجید میں ملتی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

وَإِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلاَئِکَة إِنِّی جَاعِلٌ فِی الاَرْضِ خَلِیفَة قَالُواْ أَتَجْعَلُ فِیها مَن یُفْسِدُ فِیها وَیَسْفِکُ الدِّمَاء وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَکَ قَال اِنِّی أَعْلَمُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ۔5

اور (یاد کرو اس وقت کو) جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں، کہنے لگے (ملائکہ) تُو اسے بنانے والا ہے جو فساد برپا کرے گا اور خون خرابہ کرے گا۔ اور ہم تیری حمد اور تقدیس بیان کرتے ہیں، فرمایا جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔"

گویا قابلیت اور صلاحیت کا تصور روزِ اول سے ہی مسلمہ ہے۔ اس مضمون کی اگلی آیت ملاحظہ کیجیے:

قَالَتْ إِحْدَاہمَا يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْه إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ۔6"

شعیبؑ کی ایک بیٹی کہنے لگی اے باباجان انہیں ملازمت پر رکھ لیں کیوں کہ بہتر ملازم وہ ہے جو طاقت ور اور امانت دار ہو۔"

ایک مقام پر ارشاد ہوا:

قَالَ إِنَّ اللّٰه اصْطَفَاه عَلَيْكُمْ وَزَادَه بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللّٰه يُؤْتِي مُلْكَه مَن يَشَاء وَاللّٰه وَاسِعٌ عَلِيمٌ۔7"

نبی نے فرمایا اسے (طالوت کو) اللہ نے منتخب کیا ہے اور اسے علم اور جسم میں زیادہ کشادگی دی ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنا ملک اسے عطا کرتا ہے اور اللہ وسعت والا اور علم والا ہے۔"

اللہ رب العلمین نے فرمایا:

وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَآتَاه اللّٰه الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَه مِمَّا يَشَاء8

"اور قتل کرڈالا داؤدؑ نے جالوت کو، اور اللہ نے اُن کو ملک (طالوت کے بعد) عطا کیا اور نبوت بخشی اور علم دیا جس چیز کا چاہا۔

اللہ رب العلمین نے فرمایا:

قَالَ يَا أَيُّها الْمَلأُ أَيُّكُمْ يَأْتِينِي بِعَرْشِها قَبْلَ أَن يَأْتُونِي مُسْلِمِينَ۔9"

فرمایا (سلیمانؑ نے) اے دربار والو! تم میں کوئی صلاحیت رکھتا ہے کہ اُن کا تخت میرے پاس لے آئے قبل اس کے کہ وہ لوگ فرمانبردار ہو کر آئیں۔"

قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِه أَسْتَخْلِصْه لِنَفْسِي فَلَمَّا كَلَّمَه قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مِكِينٌ أَمِينٌ۔قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَآئِنِ الأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ۔وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْها حَيْثُ يَشَاء نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَن نَّشَاء وَلاَ نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ۔10"

بادشاہ نے حکم دیا اسے میرے پاس لاؤ میں اسے اپنا خاص خلیفہ بناؤں گا۔ پھر جب اُن (یوسفؑ) سے گفتگو کی تو کہا (بادشاہ نے) آج سے آپ (یوسفؑ) ہمارے ہاں صاحبِ مقام اور صاحب امین ہیں۔ کہا (یوسفؑ نے) مجھے اس ملک کے خزانوں پر مقرر کیجیے۔ کیوں کہ میں اس کی حفاظت بھی کرسکتا ہوں اور اس کام سے واقفیت بھی رکھتا ہوں۔ اس طرح ہم (اللہ رب

العٰلمین) نے یوسفؑ کو ملک میں جگہ دی اور وہ اس ملک میں جہاں چاہتے ٹھہرتے ہم اپنی رحمت سے جسے چاہتے ہیں عطا کرتے ہیں۔اور نیکوکاروں کی محنت کو ضائع نہیں کرتے۔"

اللہ رب العٰلمین نے فرمایا:

وَعَدَ اللَّـه الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهم فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهمْ دِينَهمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهم مِّن بَعْدِخَوْفِهمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هم الْفَاسِقُونَ.11"

اور وعدہ کیا اللہ نے تم میں اُن صاحب ایمان لوگوں سے جنہوں نے اعمالِ صالحہ کئے کہ اُن کو ملک میں خلافت عطا فرمائیں گے جیسا کہ اُن سے پہلے لوگوں (بنی اسرائیل وغیرہ) کو حاکم بنایا تھا۔اور ان کے دین کو، جسے اُس نے ان کے لیے پسند کیا اور مستحکم کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا وہ میری اطاعت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو (مشرکینِ مکہ کی طرح) شریک نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد انکار کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں۔"

مذکورہ آیاتِ قرآنیہ سے ثابت ہوا کہ مناصب پر ایسے افراد کا تقرر ہونا چاہیے جو اس کی اہلیت وصلاحیت رکھتے ہوں۔

امانت کے معنی:

اللہ رب العٰلمین نے مناصب کو امانت سے تعبیر کیا ہے۔اس سلسلے میں قرآنِ مجید کی درجِ ذیل آیت ملاحظہ کیجیے:

إِنَّ اللّـه يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤدُّواْ الأَمَانَاتِ إِلَى أَهلِها وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُواْ بِالْعَدْلِ إِنَّ اللّه نِعِمَّا يَعِظُكُم بِه إِنَّ اللّه كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا.12"

بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل تک پہنچادو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔اللہ تمہیں عمدہ نصیحت کرتا ہے اور اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

آیت مذکورہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ رب العٰلمین نے مناصب یعنی ذمہ داریاں اہل افراد کے سپرد کرنے کا حکم دیا ہے اور اہل افراد کے لیے ذمہ داریوں کا ادا کرنا فرض ہے۔

ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ "اجتماعی زندگی کے نظم وفلاح کے لیے، اصل اصول یہ ہے کہ جو جس بات کا حق دار ہو اس کے حق

کا اعتراف کرو اور جو چیز جسے ملنی چاہیے وہ اس کے حوالے کردو۔13"۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ آیت مذکورہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں "بنی اسرائیل کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انہوں نے اپنے انحطاط کے زمانے میں امانتیں یعنی ذمہ داری کے منصب اور مذہبی پیشوائی اور قومی سرداری کے مرتبے(Positions of Trust) ایسے لوگوں کو دینے شروع کردیے جو نااہل، کم ظرف، بداخلاق، بددیانت اور بدکردار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برے لوگوں کی قیادت میں ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی مسلمانوں کو ہدایت کی جارہی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا بلکہ امانتیں ان لوگوں کے سپرد کرنا جو ان کے اہل ہوں۔ یعنی جن میں بارِ امانت اٹھانے کی صاحیت ہو۔14"۔

جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری رقم طراز ہیں" حکومت کے عُہدوں پر تقرر کے لیے کُنبہ پروری اور دوست نوازی کی بجائے صرف اہلیّت وقابلیّت کو معیار قرار دینا بھی اس حکم کی تعمیل میں داخل ہے۔ علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

والاظهر فی الآیة انها عامة فی جمیع الناس فهی تتناول الولاة فیما الیهم من الامانات فی قسمة الاموال ورد انطلامات و العدل فی الحکومات۔15"۔

علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں" کسی اسامی پر رشوت یا سفارش کی وجہ سے نااہل کا تقرر کرنا یہ بھی امانت میں خیانت ہے16"۔

آیت مذکورہ میں اجتماعی ذمہ داریوں کو امانت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی یہ اختیار اور منصب، اللہ رب العلمین کی طرف سے ایک امانت ہے اور اس امانت کو ذمے داری سے ادا نہ کرنا خیانت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُن افراد کو ان مناصب پر فائز کرنا چاہیئے جو پیش نظر منصب پر فائز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تاکہ معاشرہ ان کی قابلیت اور تجربات کے ثمرات سے مستفید ہوسکے۔ کسی منصب کے اہل کو اُس منصب پر فائز کرنا فرض ہے۔ جس کو بہ احسن طور پر انجام دینا ضروری ہے۔ جو شخص اس ذمہ داری کو صحیح طور پر انجام نہیں دیتا اس کے بارے میں اسلامی تعلیمات میں مذمت بیان ہوئی ہے۔

امانت کی ادائیگی کے متعلق چند آیات قرآنی درج ذیل ہیں۔

فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ أَمَانَتَه وَلْيَتَّقِ اللّه رَبَّه وَلاَ تَكْتُمُواْ الشَّهَادَة وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّه آثِمٌ قَلْبُه وَاللّه بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ۔17ے

"پس اگر تم میں ایک کو دوسرے پر بھروسہ ہو تو جس پر بھروسہ کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ وہ اس کی امانت ادا کرے اور اللہ سے

ڈرے جو اس کا رب ہے۔"

يَاأَيُّها الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَخُونُواْ اللّه وَالرَّسُولَ وَتَخُونُواْ أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ۔18

"اے وہ لوگوں جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کی رسول ﷺ سے خیانت نہ کرو اور نہ ہی امانتوں میں خیانت کرو حالانکہ تم علم رکھتے ہو۔"

وَالَّذِينَ هُمْ لِامَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ۔19

"اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور عہد کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

رسول اکرم اور اصحاب کا تعامل:

مناصب عطا کرتے وقت اللہ کے رسول ﷺ اور آپ کے اصحاب قابلیت وصلاحیت کو پیش نظر رکھتے تھے۔ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ مناصب نااہل افراد کے سپرد کردیتے ہوں بلکہ بڑی چھان بین اور سوچ بچار کے بعد کسی کو منصب عطا کرتے تھے۔ ایک رویت میں ہے۔

قال رسول اللہ ﷺ إذا ضُيِّعَتِ الامانة فانتظر الساعة قال: كيف إضاعتها

قال: إذاوُسِّدالامر إلى غيراهله فانتظر الساعة:20

"اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جب امانت ضایع کی جانے لگےتو پھر قیامت کا انتظار کرو۔ دریافت کیا گیا: اے اللہ کے رسول ﷺ امانت کے ضیاع سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا کہ: جب ذمہ داریوں کو نااہل افراد کے سپرد کیا جانے لگےتو پھر قیامت کا انتظار کرو۔" ایک روایت میں ہے کہ:

إنهاامانة وإنها يوم القيامة خزى وندامة، إلا من اخَذَهابحقها واڈى الذى عليه فيها:21

"یہ منصب ایک ذمہ داری ہے جو یوم آخرت، خوف اور ندامت کا سبب بنے گی۔ سوائے اس کے جو شخص اس حالت میں اس پر فائز ہوا کہ وہ اس کا حق رکھتا تھا اور اس نے اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی پوری کوشش کی۔"

ہمارے ہاں بعض ایسی روایتوں نے جگہ بنالی ہے جس سے توہین صحابہ کا پہلو نمایا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر۔

:يَاأَيُّها الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَائكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا۔22

"اے لوگوں جو ایمان لائے ہو تمہارے پاس کوئی فاسق کسی کے خلاف کوئی خبر لائے تو تحقیق کرلیا کرو" صحابیِ رسول ولید بن

عقبہ بن ابی معیط کے حق میں نازل ہوئی۔23

پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی رقم طراز ہیں "بعض روایات میں حضرت ولید بن عقبہ پر عمداً کذب وافترا کا الزام لگایا گیا ہے اور بعض مفسرین نے سورہ حجرات کی آیت 6 میں لفظ فاسق کا مصداق بھی ان کو قرار دیا ہے لیکن یہ تمام الزامات نقد و جرح کے معیار پر کھرے نہیں اترتے۔24"

اللہ کے رسول ﷺ کے عہد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ذمہ داریاں، سورۃ النساء کی آیت نمبر 57 کے حکم کے تحت اُن کی قابلیت اور مہارت کے بنیاد پر دی جاتی تھیں۔

اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے "حکومت اس کے لیے اچھی ہے، جس نے اپنی قابلیت کی بنیاد پر اسے حاصل کیا اور پھر اس کا حق ادا کیا اور حکومت اس کے لیے بری ہے، جس نے اس کی صلاحیت نہ ہونے کے باوجود حاصل کیا، اس کے لیے حکومت روزِ قیامت باعث حسرت ہوگی۔"25

اسلام میں سرکاری عہدہ تفویض کرنے سے قبل جن مطلوبہ شرائط واہلیت کا التزام کیا جانا چاہیئے، اس کا اندازہ اس روایت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے خود اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں عرض کیا "اے اللہ کے رسول! کیا آپ مجھے عامل نہیں بنائیں گے؟ اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: "اے ابوذر! تم کمزور ہو! اور یہ امارت امانت ہے اور یہ قیامت کے دن بدنامی اور شرمندگی کا باعث ہوگی، البتہ جو امارت کے حقوق ادا کرے اور اس کی ذمہ داریاں پوری کرے۔26"

اس اہم فریضے کی ادائیگی کے مکلّف معاشرے کے ذمہ دار لوگ ہیں۔ اسلام کی رو سے کسی اختیار کا ذمہ دار وہ شخص ہوسکتا ہے جو اس اختیار کو اللہ کی ایک امانت سمجھ کر استعمال کر سکے۔ منصب اور ذمہ داری اعزاز کے ساتھ ایک اہم فریضہ ہے جس کا حساب بھی بڑا سخت ہوگا۔ اللہ رب العلمین کا فرمان ہے:

ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ يَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ:27"

پھر اس دن تم سے نعمتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا"

اسلام مکلفین سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اجتماعی ذمہ داریوں پر ایسے افراد کو فائز کریں بلکہ شہریوں کی خدمات پر اُنہیں مامور کریں جو اس کی اہلیت رکھتے ہوں۔ یہ ذمہ داری مختلف واسطوں سے منتقل کی جاتی ہے۔ نبی کو یہ ذمہ

داری، اللہ رب العٰلمین کی جانب سے براہ راست حاصل ہوتی ہے اور اللہ رب العٰلمین کے نبی ہر چیز کا قلمدان اس کی اہلیت و قابلیت کے مطابق افراد کو عطا کرتے ہیں۔ اللہ کے آخری رسول ﷺ کی وفات کے بعد شورائی نظام نافذ ہوا۔ جس کی تعلیم باوسیلہ قرآن مجید اللہ رب العلمین نے آپ ﷺ کو دی اور آپ ﷺ نے اس نظام کے متعلق صحابہ کرام کی تربیت کی تھی۔ اسی پر اصحاب رسول کا تعمل رہا۔ وہ شورائی نظام یہ ہے کہ مسلم معاشرے کے چند عقل مند وقابلِ اعتبار افراد پر مشتمل مجلسِ شوریٰ، خلیفہ کا انتخاب کر کے اسے رعایا کے سامنے پیش کرے اور پھر مسلم رعایا اسے خلیفہ تسلیم کرتے ہوئے اس کے ہاتھ پر بیعت ہو جائیں۔ خلیفہ منتخب ہونے کے بعد وہ اپنے وزراء کا انتخاب کرتا اور انہیں مختلف محکموں کا قلم دان دیتا ہے۔ اور پھر وزراء دیانت دار لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر ریاست کے مختلف امور سرانجام دیتے ہیں۔

جدید دور میں ریاستی ذمہ داریاں، بذریعہ انتخاب، سونپی جانے لگی ہیں۔ الیکشن کمیشن، انتخابات کا انعقاد کرتا ہے۔ جن کی نوعیت بلدیاتی، صوبائی اور قومی/مرکزی سطح کی ہوتی ہے۔ سرکاری محکموں میں ملازمت کا حصول بذریعہ کمیشن اہلیت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

اسلام اور کوٹہ سسٹم:

اسلام میں کوٹہ سسٹم کا کوئی تصور نہیں اس کو بنیاد بنا کر کسی کا تقرر کرنا قرآنی تعلیمات کے منافی ہے۔ جیسا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے دور اقتدار میں کوٹہ سسٹم نافذ کیا گیا اور موجودہ صوبہ سندھ کی شہری اور دیہی تقسیم کی گئی جس کے مضر اثرات آج تک وارد ہو رہے ہیں۔ اسی طرح کسی مخصوص صوبے کے ڈومیسائل کو دیگر صوبوں کے مقابلے میں فوقیت دینا یا اُس ایک مخصوص صوبے کے اہل و نااہل فراد کو دیگر صوبوں میں کسی منصب پر تعینات کرنا جب کے اس صوبے میں اہلیت کا حامل شخص موجود ہو۔ اقرباء پروری، جانبداری، صوبائیت پرستی، لسانیت پرستی، مذہب پرستی، نفس پرستی، حسن پرستی، ٹھرکی پن اور رشوت خوری یہ وہ عناصر ہیں جو شارع کو پسند نہیں بلکہ اس کی ناراضی کا سبب اور دنیا وآخرت میں عذاب وعتاب کا موجب ہیں۔ تقرّر کرتے وقت مذکورہ امور کو خاطر میں نہیں لانا چاہیے صرف میرٹ کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

موزوں آدمی کی برطرفی:

فتح مکہ سے قبل، عثمان بن طلحہؓ کا خاندان بیت اللہ کا کنجی بردار تھا۔ فتح مکہ کے دن اللہ کے رسول ﷺ نے عثمانؓ بن

طلحہؓ سے بیت اللہ کی کنجی طلب کی انہوں نے دے دی۔اس کے بعد چچا محترم عباس بن عبد المطلبؓ نے بیت اللہ کی کنجی کی خواہش ظاہر کی آپ ﷺ نے عنایت نہیں فرمائی۔اس کے بعد محترم علی بن ابی طالبؓ نے بیت اللہ کی کنجی کی خواہش ظاہر کی آپ نے عنایت نہیں فرمائی۔پھر آپ ﷺ نے عثمان بن طلحہؓ کو بلایا اور انہیں یہ امانت سونپ دی۔اور اُنہوں نے اپنی ذمہ داری احسن طریقے سے انجام دی تھی چنانچہ اس ذمہ داری کے لیے عثمان بن طلحہؓ کے خاندان کو منتخب کیا گیا جس کی بنیاد ان کی وہ ثابت شدہ اہلیت تھی جو مستقبل میں اس بات کی ضمانت تھی کہ وہ اس منصب کے تقاضوں کو بااحسن خوبی ادا کریں گے۔28

یہ درست نہیں کہ اپنی ذاتی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے جو لوگ پہلے سے اپنی خدمات ایمانداری سے سرانجام دے رہے ہیں انہیں ان کے عہدے سے سبک دوش کر کے ان کی جگہ نااہل اور ناتجربہ کار لوگوں کا صرف اس بنا پر تقرر کر دیا جائے کہ وہ ہمارے بھائی، بھتیجے، بھانجے، شاگرد، مرید، یا قوم قبیلے کے لوگ ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے اُسامہ بن زیدؓ کو غزوات پر امیر بناتے ہوئے ارشاد فرمایا:

إن تطعنوا فى إمارته فقد كنتم تطعنون فى إمارة ابيه من قبل وايم ا إن كان لخليقا للإمارة وإن كان لَمِن احب الناس إلىَّ وإن ہذا لَمِن احب الناس إلى بعده:29"

تم اس کی امارت کے بارے میں اعتراض کرتے ہو، اور تم اس سے قبل اس کے والد کے بارے میں بھی یہی رویہ اختیار کر چکے ہو۔واللہ! یہ امارتِ لشکر کے لیے بالکل موزوں ہے،اس کا والد میرے لیے محبوب تھا اور یہ بھی ان کے بعد میرے لیے محبوب ہے۔"

حاکم کی ذمہ داری ہے کہ اگر کسی منصب کا اہل و موزوں فرد موجود ہے تو وہ اُسے منصب پر فائز کرے اور اگر موجود نہ ہو تو پھر موزوں ترین فرد کا انتخاب کر کے اسے یہ ذمہ داری تفویض کرے۔اگر حاکم نے اپنی کوشش کر کے یہ فریضہ سرانجام دیا تو اس نے اپنے منصب کا حق ادا کر دیا۔

اقرباء پروری:

جہاں تک اقرباء پروری کا تعلق ہے تو اگر اقرباء میں کوئی کسی منصب کا اہل و موزوں فرد موجود ہو اور اس کے مد مقابل اس سے قابل شخص موجود نہیں تو اُسے کسی کی حق تلفی کے بغیر میرٹ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پیشِ نظر منصب پر فائز کیا جا سکتا ہے۔عصرِ حاضر کے ممتاز محقق و سیرت نگار پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی رقم طراز ہیں"رشتہ داری اور قرابت کا تعلق کسی

طور سے حکومتی عہدوں اور ریاستی مناصب کے لیے مانع نہیں ہے بشرط یہ کہ وہ صلاحیت ولیاقت کی بنیاد پر کیے گئے ہوں اور محض اقرباء پروری کا اور اعزہ نوازی کی خاطر نہ کیے گئے ہوں۔" 30؎

تقرری کے اوصاف:

پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی لکھتے ہیں کہ "فوجی افسران کی تقرری کی اصل بنیاد ان کی انفرادی فوجی صلاحیت اور قائدانہ لیاقت تھی۔ تاہم کبھی کبھی موقع ومحل کی مناسبت سے بھی فوجی افسران کی تقرری کی جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں مہم کی نوعیت، دشمن کی طاقت، منزل مہم کے حالات، وقت کی ضرورت، درپیش مسائل کی ماہیت اور علاقائی سبب کو مدنظر رکھ کر موزوں ترین قائد کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ اسلامی مہم کی عددی طاقت بھی موزونیت کے معاملہ کو طے کرنے کا بسا اوقات سبب بن جاتی تھی۔ مسلم مہموں میں شریک مجاہدوں کی قبائلی یا معاشرتی حیثیت بھی بعض حالات میں انتخاب کی وجہ بن سکتی تھی۔ کیوں کہ انتخاب انہیں مجاہدین تک محدود رکھنا ہوتا تھا۔ اسی طرح ہر شعبہ کے تقاضوں کی رعایت بھی تقرر کی بنیاد بن جاتی تھی مگر اس کو ہم دوسرے الفاظ میں افسر متعلقہ کی صلاحیت و لیاقت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ امراء سرایا، طلائع کے افسروں، راہ نماؤں اور سراغ رسانوں کی تقرری میں ان کی علاقائی اور جغرافیائی معلومات کو بھی بہت دخل ہوتا تھا۔ سبقتِ اسلام تقرری کی بنیادی وجہ نہیں تھی اور نہ ہو سکتی تھی البتہ بعض مخصوص مواقع پر اس کی رعایت ممکن تھی۔ اسی طرح دینی بصیرت اور تعلیمی لیاقت، مذہبی اور تبلیغی مہموں میں تو، وجہِ تقرری بن سکتی تھیں مگر خالص فوجی مہمات میں ان کی جگہ زیادہ سے زیادہ ثانوی ہو سکتی تھی۔ معاشرتی مقام و مرتبہ اور خاندانی شرف ونجابت کا تو خیر کوئی لحاظ اسلامی فوجی نظام میں ممکن نہ تھا۔ البتہ منزلِ مہم پر آباد قبائل کی رعایت سے کسی حد تک قبائلی تعلق کو مدنظر رکھا جاتا تھا۔ رشتہ داری، قرابت اور خاندانی تعلق نہ تو تقرری کی بنیاد بنتے تھے اور نہ ہی مانع تھے۔ اسی طرح عمر بھی کوئی وجہِ تقرر نہ تھی۔ عموماً نوجوانوں اور جوانوں کو ترجیح دی جاتی تھی البتہ تجربہ ومہارت خاصی اہم بنیادیں تھیں 31"؎

خلاصہ:

مذکورہ بحث سے ثابت ہوا کہ اسلام کا تصورِ اہلیت ایسا قابل عمل نظام ہے جس میں اسلامی شریعت کے نفاذ اور اجتماعی مفاد کے امکانات زیادہ قوی ہوتے ہیں. عصرِ حاضر میں لوگ مذہب کے لبادے میں عدل، انصاف، اسلام اور میرٹ کی بات کرتے ہیں اور دوسری جانب اسلامی تعلیمات کی دھجیاں بکھیرتے ہیں۔ آج کے دور میں ذاتی قرابت داری یا ذاتی

پسند و ناپسند اور مفادات کی بنا پر اکثر وبیشتر مناصب کو تقسیم کیا جاتا ہے، جب کہ اسلام کی نظر میں موزوں ترین اہلیت کو نظر انداز کرنا صریحاً ناجائز ہے۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ اہلیت کے حامل شخص کا ماضی بے داغ ہونا چاہیے اور یہ کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو نبھانا جانتا ہو اور یہ کہ وہ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال نہ کرے بلکہ اپنے اختیارات کو ذاتی مفاد و عیش میں صرف کرنے کی بجائے قومی مصالح کے تحت اپنی خدمات پیش کرے۔ یہ بات بھی مشاہدے میں آئی ہے کہ صاحب اقتدار سیاسی جماعتوں کے بعض کارکنان نااہل لوگوں سے رشوت لے کر ان کے لیے سرکاری ملازمتوں پر اپنے وزراء کے ذریعے تعیناتی کے احکامات صادر کرواتے ہیں جو کہ اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہے۔

حوالہ جات:

1۔ سورۃ یٰس (36) آیت:83

2۔ سورۃ یوسف (12) آیت:40

3۔ سورۃ النساء (4) آیت:105

4۔ سورۃ الحج (22) آیت:41

5۔ سورۃ البقرہ (2) آیت:30

6۔ سورۃ القصص (28) آیت:26

7۔ سورۃ البقرہ (2) آیت:247

8۔ سورۃ البقرہ (2) آیت:251

9۔ سورۃ النمل (72) آیت:38

10۔ سورۃ الیوسف (12) آیت:54،55،56

11۔ سورۃ النور (24) آیت:55

12۔ سورۃ النسآء (4) آیت:58

13۔ آزاد، ابوالکلام، تفسیر ترجمان القرآن، اسلامی اکیڈمی، لاہور، ج:1،ص:416

14۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، طبع دوازدہم، ج:1،ص:362

15۔ الازہری، پیر محمد کرم شاہ، تفسیر ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، 1995ء، ج:1،ص:355

16۔ سعیدی، علامہ غلام رسول، تفسیر تبیان القرآن، ، فرید بک اسٹال، لاہور، طبع الثامن، جنوری 2009ء، ج:2،ص:701

17۔ سورۃ البقرۃ (2) آیت:283

18۔ سورۃ الانفال (8) آیت:27

19۔ سورۃ المؤمنون (23) آیت:8

20۔ بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل، الصحیح بخاری، طبعۃ دارِ طوق النجاۃ، دمشق، طبع الاولیٰ، 1422ھ، کتاب العلم،

حدیث:59،ج:1،ص:21القشیری،ابوالحسن مسلم بن الحجاج،الصحیح مسلم،کتاب الإمارۃ،باب کراھۃ الإمارۃ بغیر ضرورۃ،دارِاحیاءالترث لعربی،بیروت،حدیث:1825،ج:3،ص:1457

22 سورۃ الحجرات(49) آیت:6

23 ثبوت کے لیے ملاحظہ کیجیے:تفسیر خزائن العرفان،تفسیر ضیاء القرآن،تفسیر تفہیم القرآن،وغیرہ۔

24 صدیقی،پروفیسر لیٰیین مظہر،عہدنبوی کا نظام حکومت،الفیصل ناشران وتاجران کتب،لاہور،جون1995ء،ص:71

25 طبرانی،سلیمان بن احمد،المعجم الکبیر،ج:5،ص:127

26 صحیح مسلم،3:145،رقم:182

27 سورۃ التکاثر(102) آیت:8

28 ابن کثیر،حافظ عمادالدین،تفسیر ابن کثیر اردو(پارہ5)،نور محمد کتب خانہ،کراچی،ج:1،ص:51

29 صحیح بخاری:حدیث:4469۔ج:6،ص:16

30 صدیقی،پروفیسر لیٰیین مظہر،عہدِ نبوی کا نظامِ حکومت۔الفیصل ناشران وتاجران کتب،لاہور،جون1995ء،ص:51

31 ایضاً،ص:63-64

بغداد کی علمی سرگرمیاں ـــــ ایک تاریخی جائزہ

☆لاریب

قوموں کی تعمیر وترقی ان کے اپنے افراد کی مرہون منت ہوتی ہے۔افراد اپنا یہ فریضہ اسی وقت بحسن وخوبی ادا کر سکتے ہیں جب قوم کا نظام تعلیم و تربیت ان کے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں کے مطابق ہو۔تاریخ عالم پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات بالکل واضح نظر آتی ہے کہ کئی ترقی یافتہ اقوام اپنے ناقص تعلیمی نظام کے باعث اخلاقی، روحانی اور مادی اعتبار سے گرتے گرتے دنیا سے معدوم ہوگئیں۔اللہ نے دنیا کے تمام انسانوں کی رہنمائی کے لیے جو ضابطۂ حیات مقرر کیا تھا اس کی تبلیغ اور اشاعت کے لیے دنیا کے ہر خطے میں اپنے انبیاء مبعوث فرمائے۔حضرت محمد ﷺ اس سلسلے کے آخری نبی تھے جن کی مکمل اور جامع تعلیمات کے بعد کسی اور نبی کی ضرورت باقی نہ رہی۔انہوں نے آج سے چودہ سو سال پہلے کے عرب معاشرے میں ایک بگڑی ہوئی قوم کو سنوارنے کے لیے جو اقدامات کیے وہ دراصل اسلام کی حقیقی تعلیمات اور اللہ کے بتائے ہوئے راستے کی عملی تفسیر تھے مسلمان ان ہی تعلیمات سے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کے تمام معاملات میں رہنمائی حاصل کرتے رہے ہیں۔ حضرت محمد ﷺ نے جس انداز پر دین اسلام کی تبلیغ کی وہ نہ صرف یہ کہ انتہائی مؤثر اور کامیاب تھا بلکہ اس سے تعلیم و تربیت کے ایسے اوصاف بھی نمایاں ہوئے جو متعلمین اور معلمین دونوں ہی کے لیے روشن مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔آپ ﷺ نے خود لوگوں کو تعلیم دی اور پھر ان لوگوں میں سے دوسروں کو تعلیم دینے کے لیے افراد کا انتخاب کیا۔آپ ﷺ کے منتخب کیے ہوئے معلمین نے درس و تدریس میں جس مہارت کا ثبوت دیا وہ آپ ﷺ کی ہمہ گیر تربیت کا نتیجہ تھا جس کے اثرات بہت بعد تک محسوس کیے جاتے رہے۔ابتدائی دور میں علم صرف مذہبی عقائد تک محدود رہا لیکن بہت جلد ہی اسے دوسرے موضوعات تک وسعت دے دی گئی۔گویا مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ مختلف شعبہ ہائے زندگی کی تعلیم بھی نصاب میں شامل رہی۔

☆ ریسرچ اسکالر، شعبہ تاریخ اسلامی، کراچی یونیورسٹی

اسلام دنیا کا وہ واحد مذہب ہے جس نے علم کے بارے میں یہ تصور رائج کیا کہ دنیا کی تمام مخلوق میں انسان کو صرف اس لیے برتری حاصل ہے کہ اسے علم سے نوازا گیا ہے۔ گویا اسلام نے تمام انسانوں کو مساوی حیثیت عطا کی ہے ان میں کسی کو کسی پر فوقیت نہیں سوائے ان لوگوں کے جو علم میں دوسروں سے برتر ہیں۔

عہد خلفائے راشدین کے بعد جب بنوامیہ کا دور آیا تو انہوں نے اپنی حکومت کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے ساتھ ساتھ علم کی طرف بھی دھیان دیا۔ عربی گرامر کی ابتدا عہد اموی میں ہوئی۔ تاریخ نگاری کی ابتدا بھی اسی عہد میں ہوئی جس کا آغاز احادیث کی شکل میں ہوا۔ چنانچہ یہ عرب مسلموں کے ابتدائی ترین علوم میں سے تھا۔ بہت سی مذہبی اور فلسفیانہ تحریکوں کا سراغ بھی اموی عہد میں لگا سکتے ہیں جنہوں نے آگے چل کر اسلام کی بنیادوں کو ہلانا تھا۔ عوامی تقریر بازی کی متعدد صورتیں اموی عہد کے دوران ہی شکل پذیر ہوئیں۔ امویوں کے تحت سب سے زیادہ عقلی کامیابی بلاشبہ شاعری کے شعبے میں ہوئی۔ محبت کی شاعری کے علاوہ سیاسہ شاعری بھی ظہور پذیر ہوئی۔ طب اور کیمیا میں بھی اہم کام کیے۔(۱)

عہد بنوامیہ کے بعد عباسیوں نے اپنی حکومت قائم کی۔ مسلم تاریخ کی دیگر سلطنتوں کی طرح عباسی سلطنت نے بھی اپنی سیاسی و عقلی زندگی کا شاندار ترین دور اپنے قیام کے بعد حاصل کیا۔ خلافت بغداد کی بنیاد السفارح اور المنصور نے رکھی اور یہ تیسرے خلیفہ المہدی اور نویں خلیفہ الواثق کے ادوار کے درمیانی عرصہ میں اپنے عروج کو پہنچی، بالخصوص ہارون الرشید اور اس کے بیٹے المامون کے زمانے میں۔ الواثق کے بعد ریاست خلیفہ المستعصم (سلسلے کا ۳۷واں حکمران) کی زیر قیادت انحطاط کے راستے پر چل نکلی اور ۱۲۵۸ء میں منگولوں کے ہاتھوں حتمی تباہی سے دوچار ہوئی۔ عباسی ریاست اپنے عہد عروج میں کسی طاقت اور رفعت کو پہنچی اس بات کا اندازہ اس کے خارجہ تعلقات کی جانچ پڑتال، دارالحکومت بغداد میں اشرافیہ کی زندگی اور دربار کے مطالعہ اور المامون کی زیر سرپرستی معراج کو پہنچنے والی لاثانی عقلی بیداری کے جائزے کے ذریعے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔(۲)

محض چند عشروں کے اندر اندر عرب محققین نے وہ سبھی کچھ اپنے اندر سمیٹ لیا جسے یونانیوں نے صدیوں میں بنایا تھا۔

نکلسن کا بیان ہے کہ "سلطنت عباسیہ کی وسعت، دولت و ثروت کی فراوانی اور تجارت کے غیر معمولی فروغ کا تہذیبی ترقی میں بہت بڑا دخل تھا۔ اس دور میں تہذیبی ترقی اوج کمال پر تھی، مشرق میں اس تہذیبی ترقی کی کوئی نظیر پہلے موجود نہ تھی۔ تمام لوگ، خلیفہ سے لے کر معمولی آدمی تک تحصیل علم کے بے حد شیفتہ تھے یا کم سے کم علم و ادب کے پشت پناہ تھے۔ دور

عباسیہ میں لوگ ہزاروں میل کا سفر کر کے علم وعرفان کے مرکزوں کی طرف جاتے تھے اور شہد کی مکھیوں کی طرح علوم وفنون سے بوجھل لوٹتے تھے اور علم کے شوقین لوگوں کی علمی تشنگی بجھاتے تھے اور جو علوم وفنون اپنی مسلسل کوششوں سے حاصل کیے تھے، ان کی بنیاد پر تصانیف لکھا کرتے تھے، یہ تصانیف اس وقت بھی انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اس زمانے کے جدید علوم ہم تک پہنچانے میں ان تصانیف کو بہت بڑا دخل ہے۔ اگر یہ تصانیف نہ ہوتیں تو ان علوم کے ہم تک پہنچنے کے لیے اور کوئی صورت نہ تھی۔''(۳)

عہد عباسیہ کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کا یہ دور علوم وفنون کے حوالے سے عہد زریں کہلا سکتا ہے۔ عہد عباسی میں علوم وفنون کو بہت زیادہ ترقی حاصل ہوئی۔

علوم کی قسمیں:

مسلمانوں نے علوم کو دو قسموں میں تقسیم کیا تھا، ایک وہ علوم جن کا تعلق قرآن کے سمجھنے سے تھا، انہیں علوم نقلیہ کہا جاتا تھا۔ دوسرے وہ علوم تھے جنہیں مسلمانوں نے دوسری قوموں سے اخذ کیا تھا، انہیں علوم عقلیہ کہا جاتا ہے۔

علوم نقلیہ:

وہ علوم جن کا تعلق قرآن کے سمجھنے سے تھا، انہیں علوم نقلیہ کہا جاتا ہے۔ علوم نقلیہ یہ تھے، علم تفسیر، علم قرأت، علم فقہ، علم الکلام، علم نحو، علم لغت، علم بیان اور علم ادب۔

عباسیوں کے دور اول میں لوگ مذہبی علوم میں مشغول تھے۔ اسی زمانے میں متکلمین کا گروہ پیدا ہوا اور لوگوں نے خلق قرآن کے مسئلے پر بحث شروع کی۔ مامون نے اس مسئلے میں خاص طور پر دلچسپی لی۔ اس نے اپنے دربار میں علما کے درمیان مناظرے کی مجلسیں منعقد کرائیں۔ اسی وجہ سے لوگوں نے مذہبی امور میں دخل دینے کا الزام مامون پر لگایا ہے۔ بعض مورخین کا خیال یہ ہے کہ مناظرے کی ان مجلسوں کے انعقاد سے مامون کا مقصد یہ تھا کہ علما کے درمیان مذہبی مسائل میں جو اختلافات ہیں انہیں دور کیا جائے اور عقائد میں جو شبہات پیدا ہو گئے ہیں انہیں رفع کیا جائے تاکہ مذہبی مسائل میں مسلمانوں کا شیرازہ مجتمع ہو جائے کیونکہ مامون کے خیال میں مسلمانوں کے شیرازہ کے بکھرنے کا سب سے بڑا سبب مذہبی مسائل میں مسلمانوں کا اختلاف تھا۔ مامون معتزلہ کے مذہب کی طرف مائل تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس میں آزادیٔ رائے زیادہ تھی اور نقل کے مقابلے میں عقل پر اعتماد کیا گیا تھا۔ اس میلان کی وجہ سے اس مذہب کے پیروؤں کو مامون کے دربار میں تقرب حاصل ہو گیا

اور قصر خلافت میں ان کا اثر ورسوخ بڑھ گیا تھا۔

عباسی دور میں مسلمان جن علوم میں مشغول ہوئے ان میں ایک علم قرأت بھی تھا، اس علم کو تفسیر قرآن کے لیے پہلا مرحلہ خیال کیا جاتا تھا۔ کیونکہ تفسیر کرنے سے پہلے لفظوں کی مختلف شکلوں پر غور کرنا ضروری تھا تاکہ صحیح طور پر اس کا مفہوم سمجھا جاسکے۔ ان قرأت کے پیدا ہونے کی اصل وجہ عربی رسم الخط تھا۔ سبب یہ تھا کہ عربی کا ایک لفظ نقطوں کے اوپر نیچے کر دینے سے کئی طرح پڑھا جاسکتا تھا اور اس زمانے میں عام طور پر نقطے کا رواج نہ تھا۔ امتداد زمانہ سے قرأت کے سات طریقے پیدا ہو گئے ہر طریقے کا امام اپنا ایک الگ زاویہ نگاہ رکھتا ہے اور اس کی قرأت اسی امام کی طرف منسوب ہے۔ ہارون بن موسیٰ بصری نے سب سے پہلے علم قرأت کی طرف توجہ کی تھی۔ یہ یہودی النسل تھا اور ازد کا آزاد کردہ غلام تھا۔ اس نے ۱۷۰ھ اور ۱۸۰ھ کے درمیان وفات پائی تھی۔ ہارون بن موسیٰ نے سب سے پہلے مختلف قرأتوں کے درمیان چھان بین کی اور ان نظریات پر بحث کی جن پر ان کی بنیادیں قائم تھیں۔ اس نے ان اسناد کی بڑی سختی سے جانچ کی جن پر مختلف قرأتوں کی بنیاد رکھی گئی تھی حالانکہ ہارون بن موسیٰ معتزلی مشہور تھا لیکن بخاری اور مسلم نے اس کو قدری بیان کیا ہے اور یحییٰ بن معین نے اسے قابل اعتماد بتایا ہے۔ قرأتوں میں اختلاف کا سبب دراصل ان مستند شخصیتوں کی قرأت کے اختلاف کا سبب دراصل ان مستند شخصیتوں کی قرأت کا اختلاف تھا جو قرن اول میں گزری تھیں۔ مثلاً ابن عباسؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت عثمانؓ اور ان کے فرزندان، ان کے علاوہ قرن اول کے مشہور قاریوں کی قرأت کا اختلاف بھی قرأت کے اختلاف کا سبب بن گیا تھا۔ مثلاً حضرت عبداللہؓ ابن مسعود اور حضرت ابیؓ بن کعب کی قرأت، ان حضرات کے مابعد کے لوگوں نے ان اختلاف کو بڑھا دیا تھا۔(۴)

عباسیوں کے دور اول کے قاریوں میں یحییٰ بن حارث زماری (متوفی ۱۴۵ھ) اور حمزہ بن صیب زیات (متوفی ۱۵۶ھ) تھے یہ دونوں قاری منصور کے دور خلافت میں گزرے ہیں۔ عباسیوں کے دور اول میں ابوعبدالرحمٰن مقری (متوفی ۲۱۳ھ) اور خلف ابن ہشام نمراز (متوفی ۲۲۹ھ) بھی مشہور قاریوں میں گزرے ہیں۔(۵)

خاندان عباسی کے دور میں علم تفسیر پر بھی کام کیا گیا تھا اور مفسرین نے قرآن کی تفسیر کی طرف دو طرح سے توجہ کی، پہلی قسم کی تفسیر کو تفسیر منقول کہتے ہیں یعنی قرآن کی جو تفسیر حضرت محمد ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے منقول ہے انہوں نے اسی کو بیان کر دیا ہے۔ دوسری قسم کی تفسیر کو تفسیر بالرائے کہتے ہیں، یعنی وہ تفسیر جس میں نقل سے زیادہ عقل پر اعتماد کیا گیا ہے اس قسم کی تفسیر کے مشہور مفسر معتزلیہ اور باطنیہ فرقوں میں گزرے ہیں۔(۶)

تفسیر منقول میں زمانے کے ساتھ ساتھ ان اہل کتاب کے نظریات بھی داخل ہو گئے تھے۔(۷) جو مسلمان ہو گئے تھے ان نومسلموں نے اپنے وہ خیالات بھی تفسیر میں داخل کر دیے جو انہوں نے تورات اور انجیل سے اخذ کیے تھے۔ یہ کر دینا ضروری ہے کہ ان حضرات کا اسلام تہمت و دروغ سے بالاتر خیال کیا گیا ہے اور ان کا شمار باوثوق اہل علم میں کیا جاتا ہے۔(۸) اسی طرح مفسرین، عربی اشعار کو لغوی طور پر قرآن کی تفسیر کی بنیاد بناتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول تھا ''جب کسی لفظ کے معنی کا ابہام، قرآن سمجھنے میں دشواری پیدا کرے تو عربی اشعار پر نظر ڈالو۔'' یہی وجہ تھی کہ یہ مفسرین قرآن کی بہت سی آیتوں کی تفسیر الفاظ کے ان معانی کی روشنی میں کرتے تھے جو دور جاہلیت کے شعراء نے اپنے کلام میں استعمال کیے تھے۔(۹)

سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے لحاظ سے قرآن کی تفسیر کا رواج دور عباسیہ میں ہوا تھا۔(۱۰) عہد عباسی میں پہلی قرآن کی تفسیر فراء نے کتاب معانی القرآن کے نام سے حسین بن سہل کے مصاحب خاص عمر بن بکیر کی درخواست پر لکھی۔ ابو العباس کا قول ہے کہ ''فراء سے پہلے یہ اہم کام کسی نے انجام نہ دیا تھا اور مرا خیال ہے کہ فراء کی تفسیر میں کوئی شخص اضافہ نہیں کر سکے گا۔'' یہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ فراء نے قرآن کی تفسیر آیات کی ترتیب کے لحاظ سے کی تھی۔ یہ تفسیر چار جلدوں پر مشتمل تھی۔(۱۱) عبداللہ بن عباسؓ کے بعد مشہور ترین مفسرین میں ابن جریر تھے لیکن انہوں نے قرآن کی تفسیر کے متعلق تمام رطب و یابس کو جمع کر دیا تھا اور تفسیر میں دقت نظر سے کام نہیں لیا تھا۔ دوسرے مشہور مفسر سدی (متوفی ۱۲۷ھ) تھے۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور دوسرے ممتاز صحابہ کرامؓ کی تفسیر قرآن پر اعتماد کیا تھا۔ تیسرے ممتاز مفسر مقاتل بن سلیمان (متوفی ۱۵۰ھ) تھے، یہ اپنی تفسیر میں تورات کی تفسیر اور اس کے نظریوں سے متاثر تھے۔ جو انہوں نے یہودیوں سے اخذ کیے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ نے ان پر کذب کا اتہام لگایا ہے۔ محمد بن اسحاق بھی ایک ممتاز مفسر گزرے ہیں لیکن انہوں نے اپنی تفسیر میں یہودیوں اور نصرانیوں کے بہت سے وہ خیالات اور نظریات جمع کر دیے تھے۔ جو انہوں نے وہب بن منبہ اور کعب الاخبار سے اخذ کیے تھے لیکن یہ سب کی سب تفسریں ضائع ہو گئیں اور ان میں سے کوئی تفسیر ہم تک نہیں پہنچیں۔ صرف محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) کی مشہور تفسیر ہم تک پہنچی ہے جو تیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ طبری نے اپنی تفسیر میں رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ سے روایات نقل کرنے میں بڑی احتیاط اور دقت نظر سے کام لیا ہے۔(۱۲)

عباسیوں کا دور اول، اس لحاظ سے بھی ممتاز ہے کہ اس دور میں معتزلہ کی جماعت بہت ابھر گئی تھی جو تفسیر منقول کی پابند نہ تھی بلکہ تفسیر قرآن میں عقل پر اعتماد کرتی تھی۔ معتزلہ نے بعض قرآنی آیات کی تفسیر میں اپنے مخالفین کی تردید میں بڑا زور صرف کیا ہے اور ان آیات کی ایسی تفسیر بیان کی جو ان کے عقلی نظریات کی ہم آہنگ تھی۔ (۱۳) جولڈ زہیر نے معتزلیہ کے طریقۂ تفسیر کو سراہا ہے اور تفسیر قرآن اور مذہبی حقائق کے لیے عقل کو معیار بنانے پر معتزلہ کی تعریف کی ہے ان کا خیال ہے کہ معتزلیہ نے اس طریقہ سے ان خرافات اور خلاف عقل وفطرت تصورات ونظریات کا مقابلہ کیا ہے جو اس وقت اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ (۱۴) معتزلیہ کی مشہور تفسیروں میں، تفسیر ابوبکر الامم (متوفی ۲۴۰ھ) اور تفسیر ابن جرد الاسدی (متوفی ۳۸۷ھ) شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ابن جرد الاسدی نے بسم اللہ کی تفسیر ۱۲۰ طریقہ سے لکھی تھی۔

اس بحث ونظر سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن بہت سے ان علوم کا سرچشمہ تھا جن میں عباسیوں کے دور میں مسلمان مشغول تھے چنانچہ علماء نمونہ قرآن کو عربی زبان کے قواعد اخذ کرنے کے لیے اپنا ماخذ بنایا تھا۔ حروف کے اعراب نے صحیح تفسیر کرنے اور بعض آیات کی باریکیوں کو حل کرنے میں بڑی مدد کی تھی۔ اس موضوع پر بعض نحویوں نے مثلاً کسائی، مبرو، فراء اور خلف نحوی نے کتابیں لکھیں اور ان کا نام معانی القرآن رکھا۔ (۱۵) اسی طرح فقہاء نے اپنی فقہی آراء میں قرآن پر اعتماد کیا اور مختلف فقہی مذاہب پر کتابیں لکھیں اور ان کا نام احکام القرآن رکھا تھا۔ ان فقہا میں امام شافعیؒ، ابوبکر رازی کلیبی اور یحییٰ بن اکثم نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ (۱۶) اس کے علاوہ مورخین نے ان آیات قرآنی کی تفسیر لکھی جو مختلف اقوام کے تاریخی واقعات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ مثلاً یمن کی دولت سبا (سورۂ نمل اور سورۂ سبا)، یہود کی تاریخ (سورۂ بقرہ)، رسول اللہ ﷺ سے یہودیوں کا تصادم اور ان کا مقابلہ (سورۃ احزاب) اور حضرت موسیٰؑ سے یہودیوں کے تعلقات (سورۂ بقرہ، سورۂ نمل، سورۂ قصص) وغیرہ۔ اسی طرح متکلمین نے اپنے اصولوں سے قرآن کی تفسیر کی جو عام مسلمانوں کے معتقدات کے ہم آہنگ تھی۔ چنانچہ قرآنی دلائل سے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات سے الگ صفات کی نفی کی ہے اور ان خرافات کو مذہب سے دور کیا ہے جو اس وقت اسلام میں قرآن کی تفسیر کے راستے سے داخل ہو گئے تھے۔

شریعت اسلامیہ کے ماخذوں میں سے ایک ماخذ حدیث بھی ہے۔ حدیث حضرت محمد ﷺ کا قول، فعل اور کسی بات میں آپ ﷺ کی رضامندانہ خاموشی ہے۔ قرآن کے بعد حدیث دوسرا بڑا ماخذ ہے۔ احادیث، مسلمان فقہاء کے درمیان شدید اختلاف کا باعث بنیں وجہ یہ ہوئی کہ حضرت محمد ﷺ کے وصال کے قت عربوں کی اکثریت لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی حتیٰ

کہ امت مسلمہ کی تاریخ بھی ایک طویل مدت کے بعد مدون ہوئی۔عرب حضرت محمد ﷺ کی احادیث ایک دوسرے سے روایت کرتے رہے تھے۔اس لئے اصل احادیث میں بہت سی احادیث کے معنوں میں ابہام پیدا ہو گیا تھا۔اس کے علاوہ جن حالات اور زمان و مکان میں آپ ﷺ نے فرمایا یا عمل کیا تھا۔عموماً ان کا پتہ نہ چلتا تھا۔دوسری صدی ہجری میں عربوں نے احادیث کو مدون کرنا شروع کیا۔اس زمانے میں محدثین کا ایک گروہ پیدا ہوا۔جس میں امام مالکؒ اور امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ (متوفی ۲۵۶ھ) اور امام مسلمؒ بن حجاج تشیری بہت مشہور ہیں۔امام مالکؒ کی مؤطا، امام بخاریؒ کی صحیح بخاری اور امام مسلمؒ کی صحیح مسلم مشہور ہیں اور بلاد اسلامی میں اس وقت تک رائج ہیں۔امام مسلمؒ اور امام بخاریؒ کے بعد ابوداؤد سجستانیؒ (متوفی ۲۷۵ھ) (صاحب سنن ابوداؤد)، ابوعیسیٰؒ محمد ترمذی (متوفی ۲۷۸ھ) صاحب جامع ترمذی) اور امام نسائی (صاحب جامع نسائی) اور امام ابن ماجدؒ (صاحب سنن ابن ماجہ) پیدا ہوئے اور ان سب نے حدیث پر ایک ایک کتاب لکھی جو ان کے نام سے مشہور ہیں۔یہ سب احادیث کی مشہور کتابیں ہیں لیکن ان میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم بہت شہرت رکھتی ہیں۔احادیث کی یہ چھ کتابیں شریعت اسلامی کے ماخذ کے اعتبار سے بہت بلند درجہ رکھتی ہیں۔(۱۷)

احادیث کے راویوں میں محمد بن اسحاق بہت مشہور ہیں۔جنہوں نے مسلمانوں کی جنگوں کی تاریخ لکھی ہے۔ابن خلکان کا بیان ہے کہ امام زہری کے شاگردوں کو جب امام زہری سے سنی ہوئی کسی حدیث میں شک پیدا ہوتا تھا تو اسے دور کرنے کے لیے محمد بن اسحاق کے پاس جاتے تھے کیونکہ وہ غیر معمولی یادداشت میں مشہور تھے۔کہا جاتا ہے کہ یحییٰ بن معین، یحییٰ بن سعید قطان اور امام احمد بن حنبل، محمد بن اسحاق کو ثقہ خیال کرتے تھے اور ان کی بیان کی ہوئی حدیث قابل حجت سمجھتے تھے۔(۱۸) ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں نے تدوین حدیث کی طرف پہلی صدی ہجری میں کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی تھی۔دوسری صدی ہجری کے آغاز سے مسلمانوں نے اس کی جمع و تدوین کی طرف دھیان دیا اور بڑی تیزی سے احادیث ان سب علمی تحریکوں کا محور بن گئی جو اس وقت بلادِ اسلامی میں پھیلی ہوئی تھی۔(۱۹)

رومیوں کے بعد عرب قرونِ وسطیٰ کے واحد لوگ تھے جنہوں نے فقہ بنایا اور اس میں سے ایک جداگانہ نظام واضح کیا۔ ان میں فقہ (لغوی مطلب علم، دانش) کی بنیاد قرآن وسنت پر تھی۔فقہ وہ علم تھا جس کے ذریعے اسلام کا قانون (شریعت، قرآن میں اللہ کے احکامات اور حدیث میں پیش کردہ تشریح کا مجموعہ) بعد کی نسلوں تک پہنچا۔یہ احکامات رسوم اور عبادات، سول اور قانونی فرائض (معاملات) اور سزاؤں (عقوبہ) سے متعلقہ قواعد لیے ہوئے ہیں۔

قرآن میں ۶۰۰۰ کے قریب آیات میں سے صرف تقریباً ۲۰۰ (زیادہ تر مدنی) کو قطعی طور پر قانونی قرار دیا جا سکتا ہے۔ جلد ہی عیاں ہو گیا کہ یہ فرامین تمام مقدمات (دیوانی، فوجداری، سیاسی، مالی) کا احاطہ کرنے کے لیے کافی نہیں جو شام، عراق اور دیگر مفتوحہ ممالک میں سامنے آنے والے نئے حالات اور مختلف صورتوں میں پیش آئے یوں قیاس کی ضرورت پیش آئی۔ قیاس نے دو نئے بنیادی اصولوں کو جنم دیا۔ قیاس اور اجماع۔ یوں مسلم فقہ کو قرآن و حدیث کے علاوہ مزید دو اصول مل گئے۔ جہاں تک ''رائے'' کا تعلق ہے تو اکثر اس سے رجوع کیے جانے کے باوجود اسے پانچویں اساسی اصول کا درجہ کبھی نہ مل پایا۔(۲۰)

حدیث کو خصوصی اہمیت دینے والے مدنی مکتبۂ فکر کے برعکس عراقی مکتبۂ فکر نے قانون سازی میں قیاس سے کام لینے پر زور دیا۔(۲۱) اس عراقی مکتبۂ فکر کے قائد ابوحنیفہؒ (نعمان بن ثابت) ایک فارسی غلام کے پوتے تھے۔(۲۲) انہوں نے الکوفہ و بغداد میں شہرت پائی اور ۷۶۷ء میں فوت ہوئے۔ تاجر پیشہ ابوحنیفہؒ اسلام کے اولین اور سب سے بارسوخ فقہیہ تھے۔ انہوں نے اپنے شاگردوں کو زبانی تعلیم دی جن میں سے ایک ابو یوسف نے خراج کے موضوع پر ایک مستند کتاب ''کتاب الخراج'' کے نام سے تحریر کی۔ ابوحنیفہؒ نے قیاسی استخراج کے اصول پر زور تو دیا مگر فی الواقع اسے متعارف نہ کروایا۔ انہوں نے استحسان پر بھی زور دیا جو عدل کی بنیاد پر قیاس سے انحراف تھا۔ اپنے مدمقابل المدینہ کے امام مالکؒ کی طرح وہ بھی فقہ کا مکتبۂ فکر تشکیل دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے لیکن ابوحنیفہؒ اسلام کے اولین، سب سے بڑے اور بردبار مکتبہ فکر کے بانی بنے۔ دنیا کے تقریباً نصف سنی مسلمان انہی کے پیروکار ہیں۔ اذکار رفتہ سلطنت عثمانیہ کے علاوہ ہندوستان اور وسط ایشیا میں بھی علاقوں نے اسے باضابطہ طور پر تسلیم کیا تھا۔ مذہبی فقہی سوچ کے نظام کے طور پر Von Kremar نے اسے ''اسلام کا اعلیٰ اور رفیع ترین کارنامہ'' قرار دیا۔(۲۳)

مدنی مکتبہ فکر کے قائد مالک بن انسؒ غالباً حضرت محمدؐ کی سیرت مبارکہ اور انداز فکر سے زیادہ بہتر طور پر شناسا تھے جن کی کتاب الموطا (ہموار راستہ) زید بن علی کے مجموعے کے بعد مسلم قانون کا قدیم ترین سلامت مجموعہ ہے۔ ۱۰۰ فقہی روایات کے ساتھ اس یادگار تصنیف نے سنت کو ضابطہ دیا۔ اجماع کے پہلے فارمولا کا خاکہ پیش کیا اور مالکی مکتبۂ فکر کے لیے فقہ بنایا۔ اس فقہ نے مغرب اور اندلسیہ سے الاوزاعی اور الظاہری کے نظاموں کو بے دخل کر دیا اور آج بھی سارے شمالی افریقہ (ماسوائے زیریں مصر) اور مشرقی عربیہ میں غالب ہے۔ ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے بعد فقہی، دینیاتی تحقیقات نے اتنی زیادہ ترقی پائی کہ

عربی علم وفضل کی سب سے وسیع شاخ بن گئی۔(۲۴)

آزاد خیال عراقی اور رجعت پسند مدنی مکاتب فکر کے درمیان ایک اور مکتبۂ فکر پیدا ہوا جس نے قیاس کو مخصوص تحفظات کے ساتھ قبول کرنے کے ذریعے سنہری درمیانی راستہ اپنانے پر زور دیا۔ یہ شافعی مکتبۂ فکر ہے جس کے بانی محمد بن ادریس الشافعیؒ ہیں جو غزنہ میں پیدا ہوئے اور خاندان قریش سے تعلق رکھتے تھے۔انہوں نے مدینہ میں امام مالکؒ سے تعلیم حاصل کی لیکن ان کی زیادہ تر سرگرمی بغداد اور قاہرہ میں رہی۔شافعی مکتب آج بھی زیریں مصر، مشرقی افریقہ، فلسطین، مغربی اور جنوبی عربیہ، ہندوستان کے ساحلی خطوں اور ایسٹ انڈیز میں رائج ہے۔(۲۵)

آخری مکتبۂ فکر حنبلیہ ہے۔ جو امام شافعیؒ کے شاگرد احمد بن حنبلؒ کے نام سے منسوب اور حدیث سے ناقابل مصالحت وابستگی کا نمائندہ ہے۔ابن حنبلؒ کی رجعت پسندی نے بغداد میں معتزلی اختراعات کے خلاف راسخ العقیدگی کے قلعے کا کام دیا۔عدالت احتساب کی تادیب کا نشانہ بننے اور المامون کے دور میں پابند سلاسل رہنے، المعتصم کے دور میں قید و بند کی صعوبتیں سہنے کے باوجود ابن حنبل نے توبہ سے قطعی انکار کیا اور اقبال جرم کی روایتی صورت میں کسی ترمیم کی اجازت نہ دی۔(۲۶) ۲۸۰۰۰ سے زائد احادیث کا ان سے منسوب کردہ مجموعے''مسند'' کو طویل عرصے تک خصوصی شہرت حاصل رہی۔ تاہم، آج حنبلی مکتبۂ فکر کو وہابیوں کے سوا کہیں بھی قابل ذکر تعداد میں پیروکار حاصل نہیں۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ مندرجہ بالا چار مکاتب فکر نے روایتی عقیدے اور عقائدانہ فقہی ترقی کے لیے ضروری ہر چیز کو حتمی صورت دی اور اجتہاد کی راہ، قرآن وسنت کی مزید تفسیر وتعبیر یا قیاس کی بناء پر نئی رائے قائم کرنے کا دروازہ سنی مسلمانوں پر ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔(۲۷)

جن علوم میں عباسی دور کے مسلمان منہمک تھے ان میں ایک علم الکلام بھی تھا۔علم الکلام کا یہ مفہوم تھا کہ اقوال کو منقطی اور مناظرانہ انداز سے ڈھالا جائے۔خصوصاً معتقدات کو۔اس علم سے انہماک رکھنے والوں کو متکلمین کہتے تھے۔شروع میں یہ لوگ اپنے دائرہ بحث کو مذہبی عقائد تک محدود رکھتے تھے لیکن اس کے بعد ان لوگوں کو متکلمین کہنے لگے جو معتزلہ کی مخالفت کرتے تھے اور اہل سنت والجماعت مذہب کی پیروی کرتے تھے۔(۲۸) امام غزالی لکھتے ہیں''علم الکلام کا مقصد اہل سنت کے عقیدہ کی حفاظت اور اہل بدعت کی تشویش انگیزی سے اس کی نگرانی اور تحفظ تھا۔''(۲۹)

مشہور ترین متکلمین واصل بن عطا، ابوالہذیل علاف، نظام، ابوالحسن اشعری اور حجۃ الاسلام امام غزالی گزرے

ہیں۔(۳۰)۔

بعض محدثین نے متکلمین پر ایک اور زاویہ نظر سے نکتہ چینی کی ہے۔ان کا کہنا تھا کہ اہل بدعت کے نظریوں کی تردید کا ردعمل یہ ہوگا کہ ان کے معتقدات اور نظریوں کی غیر ارادی طور پر ترویج ہوگی۔ یہ بیان کردینا ضروری ہے کہ معتزلہ کے مسلمہ اصولوں کو تسلیم کرکے متکلمین ان کے عقائد ونظریات کی تردید کرتے تھے۔لیکن بقول امام غزالیؒ جو شخص معتزلہ کے اصول و نظریات ہی کو تسلیم نہیں کرتا۔اس کے لیے علم الکلام سے کیا فائدہ؟ متکلمین نے اپنے حریفوں، معتزلہ کے ہتھیاروں سے ہی ان پروار کیا تھا۔یعنی انہی کے اصول ونظریات سے ان کے اصول ونظریات کی تردید کی۔نیبرگ کا بیان ہے کہ متکلمین مسلمانوں کی تاریخ میں ان مسیحی پیشواؤں کی حیثیت رکھتے ہیں جو مسیحیت کی تاریخ کے ابتدائی دور میں مسیحیت کے عقائد کے تحفظ کے لیے اٹھے تھے۔ان مسیحی مدافعین نے دھریوں کے ساتھ مناظرے کیے تھے اور الٰہیات کی بنیاد رکھی اور ان مناظروں میں اپنے مخالفین کے اصول اور نظریوں سے ان کے نظریوں اور معتقدات کی تردید کرتے تھے۔اسی طرح متکلمین اسلام نے علم الکلام ایجاد کیا اور معتزلہ کے معتقدات اور عقائد کی تردید انہیں کے مسلمہ اصول اور نظریوں سے کی تھی۔(۳۱)

عباسیوں کے دور اول کے چند خلفاء نے مثلاً مامون، معتصم اور واثق نے بعض فلسفیانہ خیالات اور مذہبی مسائل میں عقلی بحثوں کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ان خلفاء نے بعض فلسفیانہ نظریوں کو قبول کرلیا تھا اور جو لوگ ان نظریوں کے مخالف تھے انہیں سخت سزائیں دی تھیں اور ان معتزلہ کی پشت پناہی کی تھی۔جنہوں نے نئے نظریوں خصوصاً خلق قرآن کے مسئلہ کو تسلیم کرلیا تھا۔اس مسئلہ اور اس کے ردعمل نے خلفاء اور متکلمین کو تقریباً پندرہ سال (۲۱۸ھ-۲۳۲ھ) تک الجھائے رکھا تھا۔(۳۲)

علم نحو ہمیں خلفائے راشدین کے دور سے ہی نظر آتا ہے۔دور عباس میں اہمیت پائی اور علم نحو کی نشو ونما بصرہ اور کوفہ میں ہوئی جو پہلی صدی ہجری میں ثقافت کے اہم مرکز تھے۔بصرہ اور کوفہ ہی میں علم عقائد اور علم فقہ کی تدوین وتشکیل ہوئی تھی اور یہیں نحویوں اور لغویوں کے مختلف اسکول پیدا ہوئے تھے۔وجہ یہ ہوئی کہ ان دونوں شہروں میں مختلف قبائل کے باشندوں کی بہت بڑی تعداد آباد تھی۔جن کا لب ولہجہ ایک دوسرے سے مختلف تھا ہزاروں نو آباد کاریگر اور عجمی، فارسی زبان بولتے تھے۔اس ماحول کی وجہ سے صحیح عربی زبان میں بہت کچھ خرابی پیدا ہوگئی تھی اور اس کے تحفظ کی شدید ضرورت محسوس کی گئی تھی تاکہ مستقبل میں قرآن میں کسی تحریف کا اندیشہ نہ رہے ابوالاسود ڈولی پہلا شخص تھا جو علم نحو کی طرف متوجہ ہوا۔یہ بنی امیہ کے عہد میں گزرا ہے۔کہا جاتا ہے کہ اس نے علم نحو کے اصول حضرت علیؓ سے سیکھے تھے۔(۳۳)

ابوالاسود نے بصرہ کے نحوی اسکول کی اساس رکھی تھی جو کوفہ اسکول سے مقدم مانا جاتا ہے اور اس سے زیادہ شہرت رکھتا ہے۔ بصرہ اسکول منطق کے نام سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے کوفہ کے نحویوں سے کوفہ اسکول کے نحویوں کی مصطلحات بصرہ اسکول کے نحویوں کی مصطلحات سے مختلف ہیں۔ اہل بصرہ کا منطق سے پہلے استفادہ کر لینا محض اتفاق نہ تھا بلکہ قدرتی امر تھا کیونکہ بصرہ میں فلسفیانہ مذاہب کا رواج دوسرے شہروں سے بہت پہلے ہو گیا تھا۔ بصرہ کے نحویوں میں شیعہ اور معتزلہ کی بہت بڑی تعداد تھی جنہوں نے غیر ملکی فلسفہ وحکمت کا گہرا مطالعہ کیا تھا تاکہ وہ اپنے مذاہب کلامیہ میں اس سے کام لیں۔(۳۴)

بصرہ کے ممتاز ترین علمائے نحو میں ابو عمرو بن علاء(۱۵۳ء۔۷۷۰ء) تھے جو تفسیر میں منہمک تھے۔ خلیل بن احمد تھے جو علم عروض کے بانی تھے اور کتاب ''العین'' کے مصنف تھے جو عربی زبان کی سب سے پہلی ڈکشنری خیال کی جاتی ہے۔ علمائے نحو میں سیبویہ فارسی کا درجہ بہت اونچا ہے۔ جن کی کتاب ''کتاب سبویہ'' کے نام سے مشہور ہے اس کے بارے میں دی بور لکھتا ہے: ''اگر ہم کتاب سیوبہ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ وہ کتنی بلند پایہ کتاب ہے اور اس کے لیے سیبویہ کو کس قدر محنت کرنی پڑی ہوگی۔''(۳۵) متاخرین کا بیان ہے ''علماء کے لیے بڑے اونچے درجہ کی کتاب ہے اس سے استفادہ ناگزیر ہے، اس کی حیثیت وہی ہے جو طب میں قانون شیخ کو حاصل ہے۔'' بصرہ کے مشہور علمائے نحو میں اصمعی اور ابو عبیدہ کا بھی شمار ہے۔ جن کے عروج کا ستارہ ہارون الرشید کے دور میں طلوع ہوا تھا۔ ان نحویوں میں مبرد کا درجہ بھی بہت بلند ہے۔ جس کی کتاب ''الکامل المبرد'' مشہور ہے۔ مبرد نے اصمعی اور ابو عبیدہ سے کوئی ایک صدی کے بعد وفات پائی تھی۔

کوفہ کے مشہور رین علمائے نحو میں کسائی گزرے ہیں جنہیں ہارون الرشید نے اپنے بیٹوں امین اور مامون کا اتالیق مقرر کیا تھا۔ کسائی کے شاگرد فراء (متوفی ۲۰۷ھ۔۸۲۲ھ) بھی کوفہ کے مشہور نحویوں میں گزرے ہیں۔ مفصل الضبی کا شمار بھی کوفہ اسکول کے مشہور نحویوں میں ہے جن کی کتاب مفضلیات بہت شہرت رکھتی ہے۔ جسے انہوں نے خلیفہ مہدی کی خدمت میں پیش کیا تھا۔(۳۶)

عہد عباسیہ میں شعروشاعری پر بہت کام ہوا۔ عباسیوں کے دور میں شعراء کی بہت بڑی تعداد گزری ہے جس نے شاعری میں نئے نئے معانی نئے نئے موضوعات اور نئے نئے اسلوب پیدا کیے اور ان خصوصیات میں وہ تمام اسلامی، مخضرمی اور جاہلی شعراء سے ممتاز تھے۔ ان شعراء میں مشہور ترین ابونواس تھے۔ خمریات، تغزل اور صید وشکار اس کے موضوع سخن تھے۔ دور عباسی میں جس تمدن اور عیش وعشرت کا دور دورہ تھا اس تمدن اور ماحول کو اس نے اپنا موضوع بنایا تھا اور بلند پایہ قصیدے

لکھے تھے۔(۳۷)

ابن قتیبہ (۲۱۳ھ۔۲۷۶ھ) نے شاعری میں ابونواس کی پیروی کی اور اپنی شاعری میں واقعات اور ماحول کی عکاسی کی۔ مابعد کے انشاپردازوں نے انشاء پردازی میں ابن قتیبہ کی تقلید کی۔ان میں ثعالبی اور ابن خلدون قابل ذکر ہیں۔ دور عباسی کے شعراء میں ابوتمام طائی اکبر بھی امتیازی مقام رکھتا تھا۔وہ اپنے کلام میں فلسفیانہ خیالات بڑی خوبی سے بیان کرتا تھا۔اس دور کے شعراء میں ابن رومی بھی مشہور شاعر گزرا ہے۔لطافت بیان،نکتہ آفرینی اور تخیل کی بلند پروازی اس کے کلام کی نمایاں خصوصیات تھیں۔اس دور کے شعراء میں ابوالعتاھیہ کا مقام بھی بہت بلند ہے۔جسے اس دور کا رئیس المتغز لین کہا جاتا ہے۔اس نے مہدی کی کنیز عتبہ پر بڑے بلند پایہ قصیدے لکھے تھے۔ابوالعتاھیہ نے وعظ و پند میں بھی بہت بلند پایہ اشعار لکھے تھے۔

دور عباسیہ کی شاعری میں معانی،اسلوب اور خیالات میں تنوع اور جدت پائی جاتی تھی۔(۳۸) پہلی صدی ہجری میں جو مذہبی فرقے (مثلاً شیعہ اور معتزلہ) پیدا ہوئے تھے اور عباسیوں کے دور اول میں بہت پھلے پھولے تھے ان میں ممتاز شعراء گزرے تھے۔جو اپنے اپنے معتقدات واصول کی مدافعت شاعرانہ زور بیان سے کرتے تھے۔ان شعراء میں ایک سید حمیری (متوفی ۱۷۳ھ) بھی تھا۔یہ کیسانی تھا اور محمدؒ بن حنفیہ بن علی بن ابی طالب کا معتقد تھا۔اس نے محمدؒ بن حنفیہ کی مدح میں بڑے بلند پایہ قصیدے لکھے تھے۔معتزلہ میں بھی بہت ممتاز شعراء گزرے تھے۔معتزلی شعرا اپنے اصول ونظریات کا پرچار اشعار کے ذریعے سے بھی کرتے تھے۔خلفاء عباسیہ نے رومیوں پر مسلسل اور پے در پے فتوحات حاصل کی تھیں۔ان فتوحات پر بہت سے شعراء نے بڑے بلند پایہ اور طویل قصائد لکھے تھے۔جن میں خلفاء کی فتح ونصرت اور مسلمانوں کے تحفظ اور دشمنوں کا خطرہ دور کرنے پر ان کی بہت تعریف کی گئی تھی چنانچہ ابوالعتاھیہ نے ایک بلند پایہ اور طویل قصیدہ لکھا تھا جب ہارون الرشید نے ہرقل کے محاربہ میں رومیوں پر فتح پائی تھی۔مروان بن حفصہ نے اپنے قصائد میں ان کامرانیوں کا تفصیل سے ذکر کیا تھا جو عباسیوں نے رومیوں پر حاصل کی تھیں۔اس طرح کے بہت سے قصیدے ہمیں ملتے ہیں جو خلفاء کی شان میں لکھے گئے۔(۳۹)

عباسیوں کے دور اول میں نثر نگاری بھی کی جاتی تھی اور ان کی ادبی تاریخ میں نثر نگاروں کا ایک ممتاز گروہ پایا جاتا ہے۔ان نثر نگاروں میں عبداللہ بن مقفع امتیازی درجہ رکھتا ہے جس نے پہلوی زبان کی متعدد کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں کیا

تھا۔ان کتابوں میں ایک ''کلیہ دمنہ'' ہے جو سنسکرت زبان کی مشہور کتاب ''قصص بیدبا'' کا ترجمہ تھا۔ یہ ترجمہ عربی ادب میں مقدم ترین خیال کیا جاتا ہے اور اسلوب بیان کی سادگی اور عبارت کی سلاست میں اعلیٰ نمونہ سمجھا جاتا ہے۔اس دور کے ادباء میں عبدالحمید کاتب بھی بہت ممتاز گزرا ہے جو شیخ صناعۃ الکتابۃ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔مورخین کا قول ہے کہ اس نے خط و کتابت کا جو نیا انداز اور نیا اسلوب اختیار کیا تھا اس کی تعریف ممکن نہیں۔عبدالحمید نے خط و کتابت میں چند جدید اصول ایجاد کیے، مثلاً خطوط کے شروع میں تعریفی القاب لکھنا اور ضمنی عنوان اور نئے پیرے قائم کرنا اور مکتوب الیہ کے لیے مناسب الفاظ پر خط کو ختم کرنا۔خطوط میں ملکی حالات اور سیاسی حالات پر تفصیل سے بحث کرنا،خطوط میں ان چیزوں کا رواج اس سے پہلے نہیں تھا۔عبدالحمید نے کوئی کتاب اپنی یادگار نہیں چھوڑی ہے لیکن چند مشہور خطوط چھوڑے ہیں جو ادب اور تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ان میں مشہور ترین ایک خط وہ ہے جو اس نے نثر نگاروں کو لکھا تھا۔دوسرا وہ خط ہے جو اس نے آخری اموی فرماں روا مروان بن محمد کو ولی عہدی کے زمانہ میں لکھا تھا۔اس خط کا انداز نگارش عربوں کے اسلوب بیان اور عجمیوں کے طرز بیان دونوں میں ایک لطیف امتزاج کا حامل ہے۔یہ خط معانی کی لطافت، گہرائی، مافی الضمیر کی ادائیگی کی خوبی اور مناسب الفاظ کی ترتیب کے لحاظ سے بھی ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ان نثر نگاروں میں ابن قتیبہ بھی ہے۔جو تیسری صدی ہجری کے نصف آخر میں بغداد میں رہا۔اس کی کتابوں میں ''کتاب المعارف'' اور ''کتاب الشعر والشعراء'' ہے جس میں شاعری کے جدید رجحانات کی تعریف کی گئی ہے اور قدیم شاعری پر سخت تنقید کی گئی ہے۔اس کی تصانیف میں ''ادب الکاتب'' بھی ایک اہم کتاب ہے اور ایک ''کتاب عیون الاخبار'' ہے جو بڑے پایہ کی کتاب ہے۔اسے ابن قتیبہ نے دس مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے۔(۴۰)

اس دور کے نثر نگاروں میں عمرو بن بحر جاحظ بصری بھی امتیازی مقام رکھتا ہے جو آزادیٔ فکر کا علمبردار اور معتزلی معتقدات کا پرستار تھا اور ان کا ایک ممتاز رہنما تھا، حتیٰ کہ معتزلہ میں ایک فرقہ پیدا ہوا جو جاحظیہ کہلاتا تھا۔یہ فرقہ اسی جافظہ کی طرف منسوب تھا۔جافظہ کی تصانیف ''کتاب الحیوان''، ''کتاب البیان والتبیین'' بہت مشہور ہیں۔(۴۱)

علوم عقلیہ:

وہ علوم جنہیں مسلمانوں نے دوسری قوموں سے اخذ کیا تھا۔ان علوم عقلیہ کہا جاتا تھا۔اس قسم کے علوم کو علوم قدیمہ اور عجمی قوموں کے علوم بھی کہتے تھے۔فلسفہ، ہندسہ، نجوم، موسیقی، طب، سحر، کیمیا، تاریخ اور جغرافیہ علوم عقلیہ ہیں۔(۴۲)
مسلمان عہد عباسی میں علوم عقلیہ کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔(۴۳)

نکلسن کا بیان ہے ''مسلمانوں نے اپنے نظریات اور علوم میں یونانی ثقافت سے مدد لی تھی جو سکندر کی فتوحات کے زمانے سے مصر، شام اور مغربی ایشیا میں پھیلی ہوئی تھی پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں مذہبی اختلافات کی بنا پر جب رھافی اسکول میں اضمحلال پیدا ہو گیا تھا۔ اس وقت جن علماء کو جلا وطن کیا گیا تھا وہ بلاد فارس چلے گئے تھے۔ کسریٰ نوشیرواں (۵۳۱۔ ۵۷۸ء) نے انہیں پناہ دی اور ان کی مدد سے جدید افلاطونی فلسفے کے اسکول کو وسعت دی۔ جسے شہنشاہ گستینان نے برباد کیا تھا اس نے اس اسکول کے علماء پر الزام لگایا تھا کہ وہ دھریت کے خیالات کا پرچار کرتے ہیں۔ نوشیرواں نے خوزستان کے شہر جندی ساپور میں ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی تھی جس میں ان علماء کو

طب اور فلسفہ پڑھانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ اس دارالعلوم کے اثرات ان شہروں میں عباسیوں کی حکومت کے قیام تک باقی تھے۔ بلاد عراق میں حران یونانی ثقافت کا آخری مرکز تھا۔ اہل حران نے جو صائی تھے اور عربی زبان بلا تکلف بولتے تھے۔ مسلمانوں کو یونانی ثقافت سے روشناس کرانے میں بہت حصہ لیا تھا۔ انہوں نے بہت سی غیر ملکی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ (۴۴)

بنی امیہ کے عہد میں عربی زبان میں دوسری زبانوں کی کتابوں کے ترجمہ کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی تھی خالد بن یزید بن معاویہ پہلا شخص تھا جس نے علوم طب اور کیمیا کی کتابوں کو عربی زبان میں ترجمہ کرانے کی طرف توجہ مبذول کی تھی۔ اس نے یونانیوں کے ایک گروہ کو بلایا تھا جو اس وقت مصر میں آباد تھے اور ان سے کہا تھا کہ وہ یونانی اور قبطی زبان کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کریں جن میں عملی کیمیا پر بحث کی گئی ہے۔ عبدالملک بن مروان نے دفاتر کی سرکاری زبان عربی قرار دی تھی۔ اس سے پہلے یونانی اور فارسی زبانیں سرکاری زبانیں تھیں۔ مصر کی سرکاری زبان، ولید بن عبدالملک کے دور میں عربی زبان قرار دی گئی تھی۔ اس سے پہلے یونانی اور قبطی زبانیں سرکاری زبانیں تھیں۔ اس کا اثر یہ پڑا تھا کہ دوسری زبانوں کا ترجمہ عربی میں کیا جانے لگا تھا۔

جب ایرانیوں کی مدد سے سلطنت عباسیہ قائم ہوئی اور عربوں اور ایرانیوں کے درمیان اختلاط پیدا ہوا اور عباسی خلفاء نے علوم فارسی اور علوم یونان کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی۔ اس وقت غیر ملکی زبانوں سے ترجمہ کے کام کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔ ابو جعفر منصور نے سب سے پہلے کتابوں کے ترجمہ کی طرف دھیان دیا اور اس کے حکم سے حنین بن اسحاق نے طب میں بقراط اور جالینوس کی چند کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ (۴۵) ابن مقفع نے کتاب ''کلیلہ و دمنہ'' کا ترجمہ پہلوی زبان سے عربی

میں کیا، اسی نے السندھند اور کتاب اقلیدس کا عربی میں ترجمہ کیا تھا۔

ہارون الرشید نے رومۃ الکبریٰ کے چند شہروں کی تسخیر کے بعد غیر ملکی کتابوں کے ترجمہ کا حکم دیا تھا جو اسے ان فتوحات کے درمیان دستیاب ہوئی تھیں۔ برامکہ نے مترجمین کی حوصلہ افزائی کی اور ان پر بے شمار مال و دولت کی ارزانی کی، اس کی وجہ سے ترجمہ کے کام سے غیر معمولی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ مامون کے عہد میں غیر عربی زبانوں سے خصوصاً فارسی اور یونانی زبانوں سے عربی میں نقل و ترجمہ کی تحریک بہت ترقی کر گئی تھی مامون نے قسطنطنیہ اپنے وفود بھیجے تھے تا کہ وہ فلسفہ، ہندسہ، موسیقی اور طب کی بلند پایہ کتابوں کو حاصل کریں۔ مامون نے ان کتابوں کی نقلیں کرانے کے لیے ارباب علم کی جس جماعت کو بھیجا تھا اس میں حجاج بن مصر، ابن بطریق اور بیت الحکمہ کا افسر اعلیٰ سلما اور دوسرے ممتاز افراد شامل تھے۔ اس گروہ نے وہاں کی چوٹی کی کتابوں کا انتخاب کیا ان کی نقلیں لیں اور واپس آ کر مامون کی خدمت میں پیش کیا۔ مامون نے فوراً ان کے ترجمہ کا حکم دے دیا۔ قسطا بن لوقا ان کتابوں کے ترجمہ نگران مقرر کیا گیا جو یونانی، سریانی اور کلدانی زبانوں میں تھیں۔ یحییٰ بن ہارون ان کتابوں کا نگران تھا جو قدیم فارسی زبان میں تھیں۔

ترجمہ کی طرف صرف مامون نے ہی خصوصی توجہ مبذول نہیں کی تھی بلکہ اس دور کے متمول اور ارباب ثروت نے بھی بہت سی اہم کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا تھا اس میں شاکر منجم کے بیٹے احمد، محمد اور حسن خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنہوں نے حنین بن اسحاق کو بلاد روم بھیجا تھا جو بلند پایہ اور اہم کتابیں وہاں سے لایا تھا۔ (۴۶)

مامون کے عہد میں غیر عربی زبانوں کی کتابوں کے ترجمہ اور نقل کے کام سے ہمہ گیر دلچسپی کا ایک اثر یہ ہوا کہ بہت سے علماء نے ان کتابوں کی تعلیم شروع کر دی۔ جو عربی زبان میں منتقل کی گئی تھیں۔ ان علماء نے ان کی شرحیں اور حاشیے لکھے اور ان کی اغلاط کی تصحیح کی۔ ان علماء میں یعصوب بن اسحاق کندی خاص طور پر قابل ذکر ہے جو طب، فلسفہ، ریاضیات، منطق، ھندسہ اور علوم نجوم کا بہت بڑا فضل تھا۔ اس نے اپنی تالیفات میں ارسطو کا اسلوب بیان اختیار کیا اور بہت سی فلسفہ کی کتابوں کا ترجمہ کیا اور ان کے پیچیدہ مسائل کی شرح لکھی۔ مسلمانوں میں چار ممتاز اور مشہور مترجم گزرے ہیں۔ حنین بن اسحاق، یعقوب بن اسحاق کندی، ثابت بن قرہ مرانی اور عمر بن فرخان طبری۔ عباسیوں نے ان تمام علمی کتابوں کا ترجمہ کرایا تھا جو یونان، فارس اور دوسرے ممالک سے دستیاب ہوئی تھیں مثلاً فلسفہ، طب، نجوم، ریاضیات، موسیقی، منطق، فلکیات، جغرافیہ، تاریخ، سیاست، لٹریچر، سوانح عمری کی کتابیں۔ (۴۷)

ابن ندیم کا بیان ہے منجم کے بیٹے مترجمین کے ایک گروہ کو با قاعدہ تنخواہیں دیتے تھے۔ان میں حنین بن اسحاق، جیش بن حسن اور ثابت بن قرہ اور دوسرے ممتاز فاضل مترجمین شامل تھے۔ان مترجمین کو پانچ سو دینار ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔(۴۸)

اس دور میں تعلیم اور ثقافت کے بہت بڑے مرکز مسجد یں تھیں جہاں قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی، عباسیوں کے دور میں مختلف قسم کے علوم کی تدریس کا رواج شروع ہو گیا تھا اور یہ مسجدیں علمی تحریکوں کا اہم مرکز بن گئی تھیں۔ ان میں سب سے بڑا علمی مرکز مسجد بصرہ تھی جہاں ایک طرف مناظرین کا حلقہ قائم تھا، جو مناظرہ اور بحث ومباحثہ کرتے رہتے تھے۔ دوسری طرف ارباب شعر وادب کا حلقہ تھا جو شعر وسخن میں منہمک رہتے تھے۔اس علمی ماحول سے مختلف ثقافتوں کا اثر اسلام پر بہت گہرا پڑا تھا حتیٰ کہ بعض ثقافتیں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئی تھیں۔غیر عرب جب مسلمان ہوتے تھے تو ان کے لیے ناگزیر تھا کہ وہ عربی زبان اور مسلمانوں کے آداب وعلوم سیکھیں تا کہ ان کے لیے قرآن پڑھنا پڑھانا آسان ہو جائے اور اسلامی معاشرہ کا ایک جزو بن سکیں۔اس طرح یہ نومسلم اپنی قومی ثقافت اور عربوں کی ثقافت دونوں کے جامع ہوتے تھے۔

بنی امیہ کے عہد میں کوئی خاص لائبریریاں نہیں تھیں۔لیکن عباسی دور میں جب ترجمہ اور تالیف کا رواج عام ہو گیا اس وقت لائبریریوں کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی، اس دور میں کاغذ سازی کی صنعت نے ترقی کی تھی جس کی وجہ سے کاغذ سازی کے ماہرین کی بڑی تعداد پیدا ہو گئی تھی۔اس عہد میں علمی مذاکروں کے لیے علماء اور ادیبوں کے مرکز قائم تھے۔اس علمی ماحول کی وجہ سے لائبریریاں کثرت سے قائم ہو گئی تھیں۔ جہاں مذہبی، علمی اور ادبی کتابوں کے ذخیرے جمع تھے۔مستقبل میں یہ لائبریریاں اسلامی ثقافت کے اہم مرکز بن گئی تھیں۔مشہور تاریخی لائبریری بیت الحکمت کی بنیاد ہارون الرشید نے رکھی تھی۔اس کے بعد مامون نے مختلف کتابوں اور تصانیفات کے ذخیرے اس لائبریری کو دیے تھے۔عباسی دور میں یہ سب سے بڑی لائبریری تھی۔ جو تاتاریوں کے حملے یعنی ۶۵۶ھ تک بغداد میں قائم رہی۔ یہ لائبریری اس دور کی تمام مروجہ علوم کی کتابوں پر مشتمل تھی اس لائبریری سے بے شمار علماء اور ادباء نے استفادہ حاصل کیا تھا۔ان علماء اور ادباء کا دور عباسیہ میں علمی تحریک کو فروغ دینے میں بہت بڑا دخل تھا۔علوم کی حوصلہ افزائی صرف خلفاء تک محدود نہ تھی بلکہ اس کا دائرہ وزیروں اور مملکت کے بڑے بڑے لوگوں تک وسیع تھا۔(۴۹) مسعودی کا بیان ہے ''یحیٰ برمکی کو مباحثہ اور مناظرہ سے بڑی دلچسپی تھی۔اس کے محل میں ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوتی جس میں مسلمان اور دوسرے مذاہب کے مناظرین اور متکلمین اکٹھا ہوتے تھے۔علمی ماحول کے فروغ میں اس کا بہت گہرا اثر پڑا تھا۔''(۵۰)

علم تاریخ کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہاں پر بھی عربوں نے متعدد کام کیے دی بور کا بیان ہے ''متقدمین عرب مؤرخین کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہیں واقعات کی جزئیات سمجھنے کا غیر معمولی ملکہ حاصل تھا۔لیکن واقعات کو وہ مربوط طریقہ سے بیان کرنے پر قادر نہ تھے۔عربوں کی سلطنت کی وسعت کی وجہ سے تاریخ اور جغرافیہ کے لیے بڑا مواد مل گیا تھا۔ آغاز اسلام میں عربوں کی اکثریت نوشت وخواند سے بے بہرہ تھی۔اس لیے مسلمانوں کی تاریخ مدون نہ ہوسکی۔اسلامی تاریخ کی تدوین ایک عرصے کے بعد ہوئی۔اس عبوری دور میں مشہور تاریخی واقعات اور احادیث نبویؐ کو عرب ایک دوسرے سے روایت کرتے رہے تھے۔روایت میں تبدیلی اور تحریک ناگزیر تھی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ واقعات میں ابہام پیدا ہوگیا اور اس ماحول اور زمان ومکان کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔جس میں وہ واقعات پیش آئے تھے۔دوسری صدی ہجری میں عربوں نے اپنی تاریخ کی طرف توجہ مبذول کی۔اس وقت یہ تاریخ دراصل مختلف منتشر اجزاء کی حیثیت رکھتی تھی جن کی ایک کڑی دوسری کڑی سے علیحدہ تھی اس دور میں جو تاریخیں مدون کی گئیں وہ مختلف مذاہبی فرقوں کے رجحانات کا آئینہ تھیں۔ہر فرقہ کوشش کرتا تھا کہ اپنے آپ کو بانس پر چڑھائے اور مخالف فرقہ کو تحت الثریٰ میں گرادے۔''(۵۱)

تاریخ اسلام کے مآخذ مختلف تھے۔ان میں سب سے اہم مآخذ تاریخ نبویؐ کے مآخذ یعنی قرآن مجید اور حدیث نبویؐ تھے اور اسلامی شعرا کے اشعار کا وہ مجموعہ تھا جو حضرت محمدؐ کے دور سے زبان زد تھا۔مثلاً حضرت حسانؓ بن ثابت کے اشعار جنہوں نے آنحضرتؐ کی شان اقدس میں بلند پایہ قصیدے لکھے تھے اور آنحضرتؐ کے دشمنوں کی شدید ہجو کی تھی۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ ابن مقفع نے ''کتاب خدائی نامہ'' یا ''کتاب الملوک'' پہلوی زبان سے عربی زبان میں ترجمہ کی تھی اور اس کا نام ''سیر ملوک عجم'' رکھا تھا۔یہ کتاب عربوں کے نزدیک تاریخ کا ایک نمونہ خیال کی جاتی تھی۔ہشام بن محمد کلبی (متوفی ۲۰۴ھ) اور ان کے والد محمد سب سے پہلے عرب مورخ تسلیم کیے جاتے ہیں۔یہ دونوں مؤرخ روایات میں بڑی احتیاط اور چھان بین سے کام لیتے تھے۔(۵۲) ''الفہرست'' میں ہشام بن محمد کلبی کے نام کے تحت درج ۱۲۹ کتب میں سے صرف تین بچی ہیں۔ان میں سے مشہور ترین ''کتاب الاصنام'' ہے۔لیکن دیگر کے اقتباسات الطبری، یاقوت اور دیگر تاریخ نگاروں کے ہاں مل جاتے ہیں۔

مذہبی روایات پر مبنی پہلی کتاب ''سیرت رسولؐ'' المدینہ کے محمد بن اسحٰق کی لکھی ہوئی تھی۔اس کی لکھی ہوئی یہ سوانح ہم تک صرف ابن ہشام (وفات ۸۳۴ء، قاہرہ) کی تنقیح وتہذیب میں ہی ہم تک پہنچی ہے۔(۵۳) ابن ہشام نے سیرت ابن

ہشام میں تاریخی معلومات میں اپنے استاد ابن اسحاق سے مدد لی تھی۔(۵۴) یہ کتاب آنحضرتؐ کی حیات مقدسہ اور سیرت طیبہ کا مکمل اور صحیح مرقع ہے اور آپؐ نے اسلام پھیلانے میں جو جدوجہد کی تھی اس کا پورا نقشہ پیش کرتی ہے۔ابن ہشام کی دیگر کتابوں میں ''کتاب فی النساب حمیر وملوکہا'' اور ایک کتاب ان غریب ونادر اشعار کی تشریح میں ہے جو سیرت ابن ہشام میں جا بجا آئے تھے۔(۵۵) اس کے بعد ''اسلام کی ابتدائی جنگوں اور فتوحات کے حوالے سے تحریروں کا نمبر آتا ہے۔''مغازی'' از موسیٰ بن عقبہ (وفات ۷۵۸ء)، از الواقدی کی تحریریں، الواقدی کے بعد ابن سعد کے قلم سے ہمیں کلاسیفائیڈ سوانحات کی پہلی کتاب ''طبقات الکبیر'' (۵۶) ملتی ہے جس میں آنحضرتؐ، صحابہ کرامؓ اور التابعون کے سوانح خاکے شامل ہیں۔(۵۷) مسلم تسخیرات کے سرکردہ مورخین میں سے دو مشہور مورخین تھے۔مصری ابن عبدالحکم (وفات ۸۷۰-۸۷۱ء) جس کی ''فتوح مصرو الاخبارہا'' مصر، شمالی افریقہ اور اسپین کی تسخیر کے متعلق ابتدائی ترین دستیاب دستاویز ہے اور عربی میں لکھنے والے فارسی احمد ابن یحییٰ البلاذری (وفات ۸۹۲ء) ہیں جن کی مرکزی تصانیف ''فتوح البلدان'' اور ''انساب الاشراف'' تھیں۔(۵۸) ابوجعفر محمد ابن جریر الطبری کی شہرت کا انحصار اس کی شاندار اور نہایت درست تاریخ ''اخبار الرسل والملوک'' اور ''تفسیر قرآن'' پر ہے۔تفسیر قرآن بعد کے مفسرین کے لیے ایک معیار بن گئی تھی۔تاریخ اخبار الرسل والملوک عالمگیر تاریخ پر اس کی یادگار تصنیف ہے جو عربی زبان میں پہلی مکمل تاریخ تھی۔عربوں کے ہیروڈوٹس ابوالحسن علی المسعودی نے عربوں میں تاریخ نگاری کا موضوعاتی انداز متعارف کروایا۔اس نے واقعات کو سال وار ترتیب دینے کے بجائے سلطنتوں، سلاطین اور لوگوں کو مرکز بنایا بعد ازاں ابن خلدون اور دیگر مورخین نے بھی یہی روش اختیار کی۔(۵۹) ان تفصیلات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عربوں نے جب تاریخ کی طرف اپنی توجہ مبذول کی تو دیگر علوم کی طرح یہاں بھی بے پناہ خدمات سرانجام دیں۔

عربوں نے جغرافیہ کے میدان میں بھی خاطر خواہ کامیابیاں حاصل کیں۔عباسیوں کے دور اول میں تجارت کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا اور دور دراز بحری اور بری علاقے تجارتی لحاظ سے عباسیوں کے دارالحکومت بغداد سے وابستہ ہو گئے تھے۔سفر کی تمام سہولتوں کا انتظام تھا۔راستے پرامن تھے اس کی وجہ سے سیاح، علوم کے طالب اور حقائق ومعارف کے تلاش کنندہ مختلف ملکوں اور خطوں کی طرف نکل جاتے تھے۔ان اشخاص نے مختلف ملکوں اور خطوں میں سیاحت کے بعد کتابیں اور سفر نامے لکھے جن میں اپنے تجربات اور مشاہدات قلم بند کیے اور مابعد کے مسلمان جغرافیہ دانوں کے لیے بہت بڑی دولت چھوڑ گئے تھے۔یہ کتابیں ان کے ذاتی مشاہدات اور تجربات کا مجموعہ تھیں جو انہوں نے اپنے سفروں کے دوران میں مختلف ملکوں اور

شہروں میں حاصل کیے تھے۔

دورانحطاط میں مشہور جغرافیہ دان ابن فرواز بہ پیدا ہوا جو ایرانی النسل تھا۔ یہ جغرافیہ دان تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں گزرا ہے۔اس نے اپنی یادگار کتاب المسالک والمما لک چھوڑی، جو عربی زبان میں جغرافیہ پر سب سے پہلی کتاب مانی جاتی ہے جو دراصل بحری راستہ کا ایک چارٹ ہے جو ابلہ کے اس مقام سے شروع ہوتا ہے جہاں دجلہ گرتا ہے اور ہندوچین تک بحری راستہ کی رہنمائی کرتا ہے۔(۶۰)

عہد عباسی ختم ہونے سے قبل مشرقی مسلمان جغرافیہ دانوں میں سے عظیم ترین یاقوت ابن عبداللہ الحموی (۱۲۲۹۔ ۱۱۷۹ء) گزرا ہے جس نے جغرافیائی لغت معجم البلدان کے نام سے لکھی۔اس کی معجم الدباء بھی مساوی اہمیت کی حامل ہے اس معجم میں جگہوں کے نام حروف تہجی کی ترتیب میں ہیں۔ یہ حقیقی انسائیکلو پیڈیا اس عہد میں جغرافیائی علوم، تاریخ کے متعلق قابل قدر معلومات، نسلیات اور فطری سائنس کا مجموعہ ہے۔(۶۱)

عباسیوں کے دور اول میں بعض عجمی علوم مثلاً علم نجوم، کیمیا، ریاضیات، فلسفہ اور طب نے کوئی نمایاں ترقی نہیں کی ان علوم نے دور اول کے بعد فروغ پایا۔ وجہ یہ تھی کہ دور اول میں زیادہ تر توجہ کتابوں کے ترجمہ پر مرکوز رہی لیکن اس کے باوصف دور اول میں بہت سے مسلمان ان علوم میں منہمک تھے ان میں چند ممتاز شخصیتیں بھی پیدا ہوئیں مثلاً جابر ابن حیان جو کیمیا میں بین الاقوامی شہرت رکھتا ہے۔ یہ طرطوس کا باشندہ تھا۔اہل یورپ اسے Gebar کے نام سے جانتے ہیں۔(۶۲) مصری اور یونانی پیش رووں کی طرح جابر بن حیان نے اس مفروضے پر عمل کیا کہ جست، سیسے، لوہے اور تانبے جیسی کمتر دھاتوں کو ایک پر اسرار مرکب کی مدد سے سونے یا چاندی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اپنی توانائیاں اسی پر اسرار مرکب کی تلاش کے لیے وقف کردیں۔اس نے کسی بھی اور ابتدائی الکیمیا دان کی نسبت زیادہ واضح طور پر تجربہ کرنے کی اہمیت کو شناخت اور بیان کیا اور عملی ونظری کیمیا میں قابل ذکر پیش رفت کی۔ مغربی روایات اسے مختلف کیمیائی مرکبات کا دریافت کنندہ بتاتی ہیں جن کا ذکر ہم تک پہنچنے والی اس سے منسوب بائیس عربی کتب میں نہیں ان میں سے پانچ کتب جابر سے منسوب ہیں۔ بشمول کتاب الرحمتہ، کتاب التجمیع اور ازیبق الشرقی شامل ہیں۔ جابر کے نام سے منسوب کتب چودھویں صدی کے بعد یورپ اور ایشیا دونوں میں موثر ترین کیمیائی مقالے تھے۔ جابر کے کیمیا کے دوعوامل کو سائنسی انداز میں بیان کیا۔ تکسید اور تخفیف۔(۶۳)

فطری تاریخ کے شعبہ میں عربوں کی سب سے عاجزانہ کامیابی حیوانیات میں تھی۔ البتہ ہسپانوی مسلمانوں نے علم

النباتات میں بھی نمایاں حصہ ڈالا۔ دنیائے حیوانات پر لکھنے والے عربی مصنفین بنیادی طور پر ادبی لوگ تھے جن کی کتب میں جانوروں کو عربوں کے دیے ہوئے نام اور القابات کی فہرستیں شامل تھیں اور شعراء کے حوالے بھی دیے گئے تھے۔ گھوڑے پر تحقیق سب سے زیادہ تھی اور تقریباً سائنس کے درجے تک پہنچ گئی۔ اس جانور کے متعلق متعدد خصوصی یک موضوعی رسالے ترتیب دیے گئے جن میں اس کی اقسام، جسم کے حصوں کے نام، رنگوں کا بیان اور پسندیدہ و ناپسندیدہ خصوصیات کی نشاندہی شامل ہے۔(۶۴)(۶۵)

حیوانیات اور بشریات میں ایک ابتدائی نمائندہ ابوعثمان عمرو ابن بحر الجاحظ تھا جس کی کتاب ''کتاب الحیوان'' حیاتیاتی سے زیادہ دینیاتی اور عوامی احکامات پر مبنی ہے۔ الجاحظ جانتا تھا کہ خشک عمل کشید کے ذریعے جانوروں کے فضلے سے امونیا کیسے حاصل کرتے ہیں۔ بعد کے ماہرین حیوانات مثلاً القروینی اور مصری الدمیری دونوں نے ہی نے حیوانیات کو علم اللسان اور ادب کی ایک شاخ کے طور پر لیا۔

الکیمیا سے قریبی تعلق رکھنے والے علم المعدنیات میں عربوں نے بہت کم پیش رفت دکھائی۔ قیمتی پتھروں کے لیے ان کا شوق اور معدنیات کے باطنی خواص میں دلچسپی وضاحت کرتی ہے کہ عربی مصنفین نے پچاس سے زائد جوہر تراشی کے رسالے کیوں ترتیب دیے۔ ان میں سے قدیم ترین دستیاب رسالہ نویں صدی کے عطارد ابن محمد الحاسب کا ہے لیکن مشہور ترین ''ازہار الافکار فی جواہر الاحجار'' از شہاب الدین الطفاشی نے ترتیب دیا جو ۱۲۵۳ء میں قاہرہ میں فوت ہوا۔ الطفاشی ۲۴ قیمتی پتھروں پر بحث کرتا ہے ان کا ماخذ جغرافیہ، شفافیت، قیمت، طبی اور جادوئی خواص۔ مشہور مصنف البیرونی نے تقریباً مکمل درستگی کے ساتھ اٹھارہ قیمتی پتھروں اور دھاتوں کی کثافتِ اضافی کا تعین کیا تھا۔(۶۶)

اسلام میں فلکیات کا سائنسی مطالعہ ایک ہندوستانی تصنیف ''سدھانت'' (عربی میں سند ہند) کے زیر اثر شروع ہوا جو بغداد لائی گئی۔ محمد ابن ابراہیم الغزاری نے ترجمہ کی اور بعد کے محققین نے اسے بطور ماڈل استعمال کیا۔ ساسانی دور میں ترتیب دیے گئے پہلوی

جدول (زیق) جلد ہی ترجمہ شدہ صورت (زیج) میں شامل کر دیے گئے۔ یونانی اثر جو سب سے آخر میں آیا، اہمیت میں سب سے اول تھا۔ بطلیموس کی ''المجسط'' کے ایک ابتدائی ترجمے کے بعد دو مزید بہتر تراجم ہوئے۔ ایک الحجاج ابن

مطر نے ۲۱۲ھ/ ۸۔۸۲۷ء میں مکمل کیا اور دوسرے پر حنین بن اسحٰق نے انجام دیا جس پر ثابت ابن قرہ نے نظر ثانی کی۔ المامون نے بغداد میں شماسیہ پھاٹک کے قریب اپنے بیت الحکمت کے ساتھ ایک فلکیاتی رسدگاہ تعمیر کرائی جس کے مہتمم نو مذہب یہودی سند ابن علی اور یحیٰی ابن ابی منصور تھے۔(۶۷) یہاں خلیفہ کے ماہرین فلکیات نے نہ صرف ''اجرام فلکی کی حرکات کا منظّم مشاہدہ کیا بلکہ باکمال درست نتائج کے ساتھ المجسط کے تمام انسانی عناصر کی تصدیق کی۔ طریق الشّمس کا ترچھا پن، نقاط اعتدالین کی رجعی حرکت، شمسی سال کی طوالت وغیرہ۔''(۶۸)

المامون نے جلد ہی اس رسدگاہ کے علاوہ دمشق سے باہر جبل قاسیون پر ایک اور رسدگاہ بنوائی۔ ان دنوں آلات ایک ربع دائرہ، اصطرلاب، ڈائل (دھوپ گھڑی) اور کمروں پر مشتمل تھے۔(۶۹) ابراہیم الغزاری پہلا مسلمان تھا جس نے اصظر لاب بنایا۔(۷۰)

''المامون کے ماہرین فلکیات نے تقسیم الارض کے نہایت باریک بین امور انجام دیے۔ ایک ارضی ڈگری کی لمبائی کی پیمائش اس کا مقصد کرۂ ارض کے حجم کا تعین کرنا اور اس کے کرہ ہونے کے مفروضے کی بنیاد پر قطر ناپنا تھا۔ فرات سے شمال کی طرف سنجار کے میدان پر اور البطراء (پلمائرا) کے نزدیک کی گئی ان پیمائشوں نے میرپڈیئن کی ایک ڈگری کی لمبائی ۳/۵۶۲ میل بتائی ہے۔ ایک نہایت درست نتیجہ، اس مقام پر ڈگری کی اصل لمبائی سے صرف کوئی ۲۸۷۷ فٹ زائد۔ اس طرح زمین کا محیط ۴۰۰، ۲۰ میل اور قطر ۶۵۰۰ میل بنا۔'' اس کام میں حصہ لینے والے ماہر فلکیات ریاضی دانوں میں مشہور الخوارزمی بھی شامل تھا۔(۷۱)

دی بور کا بیان ہے کہ ''فیثاغورس'' ریاضیات میں عبوں کا استاد مانا جاتا ہے یہاں تک کہ عربوں کے دل و دماغ پر اس کی شخصیت کا اتنا گہرا اثر تھا کہ ان کے نقطۂ نظر سے کوئی شخص اس وقت تک فلسفی اور طبیب حاذق نہیں بن سکتا تھا، جب تک وہ ریاضیات کی فروعات مثلاً حساب، ہندسہ، فلکیات وار موسیقی میں پوری دستگاہ نہ رکھتا ہو۔ علم الحساب میں عمران بن وضاح اور شہاب بن کثیر بہت مشہور گزرے ہیں۔ علم ہندسہ میں حجاج بن ارطاء بہت ماہر گزرا ہے جس نے منصور کے عہد میں بغداد کی جامع مسجد کا نقشہ بنایا تھا۔ یہ بیان کرنے کی شاید حاجت نہیں ہے کہ ریاضیات اور نجوم میں گہرا تعلق ہے۔(۷۲)

یوں تو علم نجوم سے عہد امیہ میں بھی مسلمان شغف رکھتے تھے لیکن ان علوم نے عباسیوں کے دور اول میں غیر معمولی ترقی کی تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب منصور کو محمد نفس زکیہ کے خروج کی اطلاع ملی تھی تو وہ گھبرا گیا تھا۔

اس موقع پر حارث منجم نے منصور سے کہا تھا کہ امیر المومنین ! آپ ناحق گھبرا گئے، خدا کی قسم اگر محمد نفس زکیہ ساری دنیا پر بھی قبضہ کرلیں جب بھی گھبرانے کی کوئی بات نہیں کیونکہ علم نجوم کے ذریعے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان کی حکومت نوے روز سے زیادہ قائم نہیں رہ سکتی۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عباسی دور میں علم نجوم پر کتنا وثوق کیا جاتا تھا۔(۷۳) یاقوت حمودی نے شہر بغداد کی تاسیس کے لیے وہی ساعت مقرر کی تھی جو نجومیوں نے اسے بتائی تھی حتیٰ کہ اس نے سنگ بنیاد اسی لمحہ میں رکھا تھا جو ماہر علم نجوم ابوسہل بن نوبخت منجم نے اسے بتایا تھا۔ ابوسہل نے منصور سے کہا تھا کہ اس خاص لمحہ میں جو بنیاد رکھی جائے گی، علم نجوم کی رو سے وہ ایک طویل مدت تک قائم رہے گی اور اس کی آبادی خوشحال اور مطمئن رہے گی۔(۷۴)

فضل بن سہل علم نجوم کا بہت بڑا ماہر تھا اور اسی علم کے ذریعے سے اس نے معلوم کیا تھا کہ مامون بہت جلد خلیفہ ہونے والا ہے۔ اس لیے اس نے اپنا تقرب بڑھانا شروع کردیا تھا اور بڑی دل سوزی اور خلوص سے مامون کی خدمت کی تھی۔ اس خدمت کے صلہ میں مامون نے خلافت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد فضل بن سہل کو اپنا وزیر بنالیا تھا۔(۷۵) فضل بن سہل کا بھائی حسن بن سہل بھی علم نجوم کا بہت بڑا ماہر تھا۔(۷۶)

عباسیوں کے دور اول میں عبداللہ بن سہل بن نوبخت بھی ایک مشہور منجم گزرا ہے۔ قفطی کا بیان ہے کہ مامون نے اسی کے مشورہ پر امام علی رضا کی بیعت کے لیے خاص ساعت کا انتخاب کیا تھا۔ عباسیوں کے دور اول میں جعفر بن عمر بلخی بھی ممتاز منجم گزرا ہے، جو ابومعشر فلکی کے نام سے مشہور ہے۔ ابومعشر نے بہت سی کتابیں لکھی تھیں ان میں ''اثبات العلوم'' اور ''ھیئۃ الفلک'' خاص طور پر شہرت رکھتی ہیں۔(۷۷)

عربوں نے فلسفہ میں بھی کافی نام کمایا۔ یونانی کتب کے ترجمے کیے۔ عربوں کے لیے فلسفہ چیزوں (جیسی کہ وہ ہیں) کی حقیقی علت کا علم تھا، جب تک کہ انہیں انسانی صلاحیتوں کی مدد سے جانچا نہ جاسکتا ہو۔ ان کا فلسفہ اپنے جوہر میں یونانی تھا۔ جس میں مفتوحہ لوگوں کی سوچ اور دیگر مشرقی اثرات نے ترمیم کی۔ اسلام کے ذہنی میلانات سے ہم آہنگ ہوا اور عربی کے توسط سے بیان کیا گیا۔ عرب یہ یقین رکھتے تھے کہ ارسطو کی تصانیف یونانی فلسفیانہ ریت کی مکمل نمائندہ تیں۔ جیسے جالینوس یونانی طبی روایت کا نمائندہ تھا۔ یقیناً اس وقت یونانی فلسفہ اور طب کا مطلب وہ سب کچھ تھا جو مغرب کے پاس تھا۔ مسلمانوں کی حیثیت میں عربوں کو یقین تھا کہ قرآن اور اسلامی الٰہیات مذہبی قانون اور تجربے کا حاصل جمع تھا۔ چنانچہ ان کی اچھوتی حصہ داری ایک طرف فلسفہ و مذہب اور دوسری طرف فلسفہ اور طب کے درمیانی میدان میں تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ

ساتھ عرب مصنفین لفظ ''فلاسفۂ'' یا ''حکماء'' کا استعمال ایسے تمام فلسفیوں کے لیے کرنے لگے جن کی قیاس آرائیاں محض مذہب تک محدود نہ تھیں۔ انہوں نے ''متکلمون'' یا ''اہل الکلام'' کی اصطلاح ان لوگوں کے لیے مخصوص رکھی جن کا نظام فکر الہامی مذہب کے تتبع سے مشروط تھا۔ آہستہ آہستہ ''کلام'' کا مطلب ''الہیات'' لیا جانے لگا اور ''متکلم'' ''ماہر الہیات'' کا ہم معنی بن گیا۔ الغزالی بنیادی طور پر الٰہیات دان تھا اور اس کے متعلق آگے چل کر بات کی جائے گی۔ ابتدائی عرب فلسفے میں عظیم ترین نام الکندی الفارابی اور ابن سینا کے تھے۔ (۷۸) یونانی فلسفہ کو اسلام کے ساتھ ہم آہنگ بنانے کا آغاز عرب الکندی نے کیا۔ جبکہ ترک الفارابی نے اسے جاری رکھا اور مشرق میں ایک فارسی ابن سینا نے اسے تکمیل کو پہنچایا۔ (۷۹)

الکندی کا پورا نام ابو یوسف یعقوب ابن اسحٰق الکندی تھا۔ خالص عربی النسل ہونے کی وجہ سے اسے ''عربوں کا فلسفی'' کہا گیا اور یقیناً وہ مشرقی خلافت میں ارسطوئی شاگرد کی پہلی اور آخری مثال تھا جس نے عربی نسل سے جنم لیا۔ اپنے نظام میں انتخابی الکندی نے نوفلاطونی انداز میں افلاطون اور ارسطو کے نظریات کو یکجا کرنے کی کوشش کی اور نوفیثا غورثی ریاضی کو تمام سائنس کی اساس قرار دیا۔ الکندی ایک فلسفی سے بڑھ کر تھا۔ وہ فلکیات، الکیمیا دان، ماہر امراض چشم اور موسیقی کا نظریہ دان تھا۔ اس سے تقریباً ۲۴۵ کتب منسوب کی جاتی ہیں، لیکن بدقسمتی سے زیادہ تر دست برد زمانہ کا شکار ہو گئیں۔ الکندی کی تحریریں اصل عربی سے زیادہ لاطینی تراجم میں سلامت رہی ہیں۔ بشمول کریمونا کے جیرارڈ کے کیے ہوئے تراجم کے۔

محمد ابن محمد ابن طرخان ابونصر الفارابی (Alpharabius) کا نظام فلسفہ (جو افلاطون اور ارسطو پر اس کے متعدد مقالوں میں آشکار ہے) ارسطوئیت اور تصوف کا امتزاج تھا اور اسے ''المعلم الثانی'' کا قابل رشک خطاب دیا گیا۔ ارسطو اور دیگر یونانی فلسفیوں کی متعدد تفاسیر کے بعد الفارابی نے مختلف نفسیاتی، سیاسی اور مابعد الطبیعیاتی کتب تصنیف کیں جن میں سے مشہور ترین ''رسالۃ فصوص الحکم'' اور ''رسالۃ فی آراء اہل المدینۃ الفضیلہ'' ہیں۔ الفارابی کی دیگر تحریریں اسے ایک اچھا طبیب اور ریاضی دان، خفیہ سائنس دان اور زبردست موسیقار ظاہر کرتی ہیں۔

الفارابی کے بعد ابن سینا (وفات ۱۰۳۷ء) نے عربی زبان میں موسیقی کی تھیوری پر اہم ترین کتب تصنیف کیں۔ اس نے اپنے فلسفیانہ خیالات میں الفارابی کا شکریہ ادا کیا۔ (۸۰) ابن خلکان کی رائے میں ''کوئی بھی مسلمان فلسفیانہ علوم میں کبھی فارابی کی ہمسری نہیں کر پایا اور اس کی تحریروں کے مطالعہ اور انداز کی نقالی کے ذریعے ہی ابن سینا نے کمال حاصل کیا اور اپنی تصنیف کو اس قدر مفید بنایا۔'' (۸۱) تاہم یہ ابن سینا ہی تھا جس نے یونانی دانش کو جمع کر کے اور اپنے جوہر قابل کی چھاپ لگا

کر تعلیم یافتہ مسلم دنیا کو قابل فہم انداز میں پیش کیا۔اس کے توسط سے یونانی نظام، بالخصوص فیلو کا اسلام میں شامل ہونے کا اہل بنا۔(۸۲)

اسلامی طب مشہور علم ہے، مسلمان علم وحکمت میں نامور تھے۔نشاۃ ثانیہ کا دور (۱۱ تا ۱۷ صدی عیسوی) مغربی طبی حلقوں میں مسلمانوں کی طبی کاوش کو قابل قدر سمجھا جاتا تھا۔صرف ایک صدی قبل ہی اسلامی طب کا نصاب یورپی جامعات سے ختم کیا گیا مگر اس کے باوجود اسلامی طب کا مطالعہ دنیا میں جاری ہے۔طب کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ ایک طبیب طب کے علاوہ دیگر علوم بالخصوص فلسفہ کا علم بھی رکھتے تھے۔مثلاً ابن رشد، محمد بن ذکریا رازی، اب سینا طب کے علاوہ فلسفہ و دیگر علوم میں مہارت رکھتے تھے۔یونانی علوم سے بھی انہوں نے استفادہ کیا مگر ان میں موجود غلطیوں کی اصلاح کی اور قیمتی اضافے بھی کیے۔اس میں مسلمان حکمرانوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

طب میں عرب مسلمانوں کی بڑی خدمات تھیں۔۸ ویں صدی عیسوی میں ہی طب پر بہت کام شروع ہو گیا تھا۔عہد عباسی میں بھی حکمرانوں نے علوم طب کی سر پرستی کی۔ابوجعفر المنصور عراق کے طبیبوں سے مشورہ لیتا تھا اور ان کی ہدایات پر عمل کرتا تھا۔(۸۳) معتصم کے دور میں مشہور اطباء میں یحییٰ بن ماسویہ گزرا ہے۔مسعودی کا بیان ہے کہ معتصم اس کے مشورہ پر غیر معمولی بھروسہ کرتا تھا۔

عباسی خلفاء جس طرح عراق اور ہدن کے اطباء پر بہت اعتماد کرتے تھے، اسی طرح یونانی طب سے بھی استفادہ کرتے تھے۔عہد واثق میں ابن بختیشوع، ابن ماسویہ، میخائیل، حنین بن اسحاق مشہور اطباء گزرے ہیں۔اس دور کے اطباء نے تشخیص امراض اور معالجات میں یونانی کتابوں اور یونانی نظریوں سے استفادہ کیا تھا۔اس کے علاوہ اپنے ذاتی تجربات سے بھی فائدہ اٹھاتے تھے۔(۸۴)

خلاصہ بحث:

درحقیقت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عباسی عہد کے بعد خالص یا طبعی سائنس کی کسی بھی شاخ میں کوئی قابل قدر پیش رفت نہ ہوئی۔آج کے مسلمان اگر صرف اپنی کتب پر ہی انحصار کریں تو ان کے پاس اس سے کافی کچھ کم ہوگا جو ان کے اجداد کے پاس گیارہویں صدی میں تھا۔طب، فلسفہ، ریاضی، علم النباتات اور دیگر علوم میں ایک خاص نقطہ تک پہنچنے کے بعد جمود طاری ہو گیا۔مذہبی اور سائنسی دونوں قسم کے ماضی اور اس کی روایات کے احترام نے عرب عقل کو بیڑیاں پہنا دیں جسے وہ ابھی جھٹکنا

شروع ہی ہوئی ہے۔

عربوں نے نہ صرف فارس کی قدیم ریت اور یونان کے کلاسیکی ورثے کو اپنے اندر سمولیا بلکہ دونوں کو اپنی مخصوص ضروریات اور سوچ کے طریقوں کے مطابق بھی بنایا۔ طب اور فلسفہ میں ان کا جداگانہ کام الکیمیا، فلکیات، ریاضی اور جغرافیہ میں کام کی نسبت کم نمایاں تھا۔ قانون، دینیات، لسانیات اور علم اللسان میں عربوں اور مسلمانوں کے طور پر انہوں نے اچھوتے غور وفکر اور تحقیق انجام دی۔ ان کے تراجم جو متعدد صدیوں کے دوران عرب ذہن کے ذریعے کافی زیادہ منتقل ہوئے۔ کئی نئی حصہ داریوں سمیت یورپ کو شام، اسپین اور صقلیہ کے توسط سے پہنچے اور اس ذخیرہ علم کی بنیاد رکھی جو قرون وسطیٰ کی یورپی سوچ پر غالب آیا اور ثقافت کی تاریخ کے نقطۂ نگاہ سے یہ منتقلی اصل تخلیق سے کم اہم نہیں۔ کیونکہ اگر ارسطو، جالینوس اور بطلیموس کی تحقیقات آنے والی نسلوں تک منتقل نہ ہوتیں تو دنیا کو شاید ان کے کبھی وجود میں آنے کا ہی علم نہ ہوتا۔

حواشی وحوالہ جات:

۱۔ حتی، فلپ کے(Philip K. Hitti)، تاریخ عرب، مترجم: جواد، یاسر، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۲۰۶ تا ۲۱۶

۲۔ ایضاً ص ۲۵۵

۳۔ Nicholson, Reynold A leyne, A literary History of the Arabs, Combridge university press, Great Britain, 8th edition, 1966, A. C, Pg. 281

۴۔ جولڈ زہیر (Goldziher)، المذاہب الاسلامیہ فی تفسیر القرآن (ترجمہ)، مترجم: عبدالقادر، علی حسن، مطبعۂ العلوم بشارع الخلیج، قاہرہ، طبع اولیٰ، ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء، ص ۳۶ تا ۳۷

۵۔ ابن قتیبہ، کتاب المعارف، دارالمعارف، قاہرہ، ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء، ص ۲۳۰ تا ۲۳۱

۶۔ ابن ندیم، کتاب الفہرست، مترجم: بھٹی، محمد اسحٰق، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، طبع دوم، ۱۹۹۰ء، ص ۴۲ تا ۴۵

۷۔ ان نومسلموں کے نام کعب اخبار یہودی، عبداللہ بن سلام اور ابن جریج ہیں۔

۸۔ کتاب المذاہب الاسلامیہ فی تفسیر القرآن، ص۔ ۶۶

۹۔ ایضاً ص ۶۸۔۶۹

۱۰۔ الفہرست، ص ۹۹

۱۱۔ ایضاً ص ۱۰۱

۱۲۔ حسن، ڈاکٹر حسن ابراہیم، تاریخ الاسلام السیاسی [مسلمانوں کی سیاسی تاریخ]، مترجم: صدیقی، علیم اللہ، مجلس ترقی ادب، لاہور، س ن، ص۔ ۶۲۰

۱۳۔ المذاہب الاسلامیہ فی تفسیر القرآن، ص ۹۹ تا ۱۰۰۔

۱۴۔ ایضاً ص ۱۳۷

۱۵۔ الفہرست، ص ۵۱ تا ۵۲

۱۶۔ ایضاً ص ۵۷

۱۷۔ Lit. History of the Arabs, Pg. 337

۱۸۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان وابناء الزمان، ج ۱،۲، مترجم: فتح پوری، علامہ اختر، نفیس اکیڈمی، کراچی، آفسٹ ایڈیشن، ۲۰۰۰ء، ص۔۶۳۲

۱۹۔ حسن، ڈاکٹر حسن ابراہیم، تاریخ الاسلام السیاسی، ج ۲، ص ۶۲۶۔

۲۰۔ تاریخ عرب، ص ۳۲۱

۲۱۔ ابن خلدون، مقدمہ، نفیس اکیڈمی، کراچی، طبع یازدھم، دسمبر ۲۰۰۱ء، ۳۲۷

۲۲۔ الفہرست، ص ۲۰۱ اور تاریخ ابن خلکان، ج۔۳، ص۔۴۷

۲۳۔ تاریخ عرب، ص ۳۲۲

۲۴۔ تاریخ ابن خلکان، ج ۱، ص ۳۱۲

۲۵۔ ایضاً، ج ۲، ص ۲۱۵ تا ۲۱۶

۲۶۔ ابن عساکر، تاریخ دمشق، ج ۲، ص ۴۱ تا ۴۴

۲۷۔ تاریخ عرب، ص ۳۲۳

۲۸۔ تاریخ الاسلام السیاسی، ج ۲، ص ۶۳۲

۲۹۔ امام غزالی، کتاب المنقذ من الضلال، ص ۱۷

۳۰۔ تاریخ الاسلام السیاسی، ج ۲، ص ۶۳۳

۳۱۔ ایضاً، ج ۲، ص ۶۳۴ تا ۶۳۶۔

۳۲۔ ایضاً، ج ۲، ص ۶۳۴ تا ۶۳۶

۳۳۔ الفہرست، ص ۶۰ تا ۶۱

۳۴۔ دوبوئر، ٹ۔ج، تاریخ فلسفہ فی الاسلام، ص ۳۸ تا ۳۹

۳۵۔ ایضاً، ص ۳۸

۳۶۔ Lit. History of the Arabs, Pg. 432-433

۳۷۔ تفصیل کے لیے دیکھئے:

Divan Des Abu Nowas: Dieveinteder (Ed by A.H. L. Wart N. 10 NV)absent. Pg. 1 to 5.

۳۸۔ تاریخ الاسلام السیاسی، ج۲،ص۶۴۰ تا۶۴۱

۳۹۔ ایضاً، ج۲،ص۶۴۲ تا۶۴۳

۴۰۔ ایضاً، ج۲،ص۶۴۴ تا۶۴۵

۴۱۔ Nichlson, Lit. History of the Arabs, Pg. 346- 347

۴۲۔ تاریخ الاسلام السیاسی، ج۲،ص۶۱۴ تا۶۱۵

۴۳۔ ایضاً، ج۲،ص۶۴۶

۴۴۔ Lit. History of the Arabs, Pg. 258

۴۵۔ الفہرست،ص۳۴۲

۴۶۔ ایضاً،ص۳۳۹ تا۳۴۰

۴۷۔ تاریخ الاسلام السیاسی، ج۲،ص۶۴۹ تا۶۵۰

۴۸۔ الفہرست،ص۳۴۰

۴۹۔ تاریخ الاسلام السیاسی، ج۲،ص۶۵۰ تا۶۵۱

۵۰۔ المسعودی، مروج الذہب ومعاون الجواہر (تاریخ المسعودی)، مترجم: شادانی، پروفیسر کوکب، ج۲، نفیس اکیڈمی، کراچی، طبع اول، نومبر۱۹۸۵ء،ص۲۸۳

۵۱۔ تاریخ الفلسفہ فی الاسلام،ص۸۰

۵۲۔ تاریخ الاسلام السیاسی، ج۲،ص۶۵۳

۵۳۔ تاریخ ابن خلکان، ج۲،ص۵۲۰

۵۴۔ تفصیل کے لیے دیکھئے تاریخ ابن خلکان، ج۱،ص۴۸۳

۵۵۔ تاریخ ابن خلکان، ج۱،ص۲۹۰

۵۶۔ طبقات ابن سعد بھی کہا جاتا ہے

۵۷۔ یہ کتاب آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ابن سعد نے ۲ جلدیں صرف سیرت نبویؐ پر لکھی ہیں۔

۵۸۔ تاریخ عرب،ص۳۱۵

۵۹۔ ایضاً ص۳۱۷

۶۰۔ تاریخ الاسلام السیاسی، ج۲،ص۶۵۴ تا۶۵۶۔

۶۱۔ تاریخ عرب،ص۳۱۴

۶۲۔ تاریخ الاسلام السیاسی، ج۲،ص۶۵۶

۶۳۔ دیگر کامیابیوں کی تفصیلات کے لیے دیکھئے،تاریخ عرب،ص۳۱۰۔

۶۴۔ تاریخ عرب،ص۳۱۰ تا۳۱۱

۶۵۔ تفصیل کے لیے دیکھئے الاصمعی ،کتاب الخیل،ایڈیٹر August Hoffner،ویانا،۱۸۹۵ء۔

۶۶۔ تاریخ عرب،ص۳۱۱

۶۷۔ الفہرست،ص۲۷۵

۶۸۔ C. A. Nallino،آرٹیکل "Astronomy"،انسائیکلوپیڈیا آف اسلام،بحوالہ صاعد''طبقات''،س ن،ص۵۰ تا ۵۱

۶۹۔ تاریخ عرب،ص۳۰۴

۷۰۔ الفہرست،ص۲۷۳

۷۱۔ تاریخ عرب،ص۳۰۴

۷۲۔ تاریخ الفلسفہ فی الاسلام،ص۸۰

۷۳۔ تاریخ الاسلام السیاسی، ج۲،ص۶۵۶ تا۶۵۷

۷۴۔ طبری، علامہ ابی جعفر محمد بن جریر، تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری)، ج ۹، مترجم: مغل، مولانا محمد اصغر، دارالاشاعت، کراچی، ۲۰۰۳، ص ۹۲۰

۷۵۔ الفخری، فی الآداب السطانیہ والدول الاسلامیہ، القاہرہ، ۱۹۲۳ء، ص ۲۰۲

۷۶۔ تاریخ الاسلام السیاسی، ج ۲، ص ۶۵۸

۷۷۔ ایضاً ج ۲، ص ۶۵۸ تا ۶۵۹

۷۸۔ تاریخ عرب، ص ۳۰۱

۷۹۔ ایضاً ص ۳۰۳

۸۰۔ ایضاً ص ۳۰۱ تا ۳۰۳

۸۱۔ تاریخ ابن خلکان، ج ۲، ص ۴۹۹

۸۲۔ تاریخ عرب، ص ۳۰۳

۸۳۔ تاریخ طبری، ج ۹، ص ۲۹۲

۸۴۔ تفصیل کے لیے دیکھئے المسعودی، مروج المذہب ومعاون الجواہر، ج ۲، ص ۲۶۴ تا ۲۶۶

دور جدید میں غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت
ایک تحقیقی جائزہ

☆ محمد عفان الحق

تمہید:

اسلام انسانیت کا درس دینے والا دین ہے۔اسلام ہر فرد سے حسن سلوک کرنے کی تاکید کرتا ہے۔جس میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں رکھی گئی بلکہ سب کو یکساں رکھا گیا ہے۔اور اسلام نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کوئی ایسا اصول اور ضابطہ بیان نہیں فرمایا جو کہ اس کے اشرف المخلوقات ہونے کے منافی ہو۔جس طرح اسلام مسلمانوں کے حقوق کی بات کرتا ہے بالکل اسی طرح غیر مسلموں کے حقوق کی بھی بات کرتا ہے۔یہ اسلام کی ہی خصوصیت ہے کہ یہ اپنے نہ ماننے والوں کو بھی جتنے حقوق اور مراعات عطا فرماتا ہے دنیا کے کسی مذہب میں اس کی مثال ونظیر نہیں ملتی۔معاشرتی تعلقات کے حوالے سے بات ہو یا کاروباری تعلقات کے حوالے سے اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ معاشرتی تعلقات یا کاروباری تعلقات سے منع نہیں فرماتا بلکہ اس کی اجازت دیتا ہے۔

ذیل میں میں ہم غیر مسلموں کے ساتھ معاشرتی ،سماجی اور کاروباری تعلقات اور شریعت میں اس کی حدود کا جائزہ پیش کریں گے۔

عصر حاضر میں غیر مسلموں سے معاشرتی تعلقات:

انسان زندگی کی ایک اہم بنیادی ضرورت غذا ہے۔اللہ سبحان تعالیٰ نے حلال وحرام کے متعلق اولین ہدایت قرآن کے ذریعے دی۔پھر رسول ﷺ نے پہلے ایک غیر مسلم معاشرے میں رہتے ہوئے بعد ازاں مسلمان معاشرے میں اس کا عملی نمونہ پیش کیا۔

☆ ریسرچ اسکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ کراچی

۱۔ غذائی اشیاء کے استعمال سے متعلق ہدایات:

آپ ﷺ نے اپنی تمام عمر مبارک عربوں کے ماحول میں گزاری اور آپ ﷺ نے وہاں رہتے ہوئے ان کی تمام جائز چیزیں کھائیں اور معاشرت کی جائز چیزوں کو اختیار بھی فرمایا۔قبل الھجرۃ مکہ میں رہتے ہوئے اللہ تعالی کی طرف سے چار حرام کردہ چیزوں کے علاوہ کسی اور چیز کو حرام قرار نہ دیا۔جن کا تذکرہ سورۃ الانعام میں فرمایا گیا ہے:

’’قُل لَّا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَن يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَّسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ‘‘۔(۱)

ترجمہ: ’’کہہ دو مجھ پر جو وحی آئی ہے اس میں کسی کھانے والے پر، جو چیزیں کہ وہ کھاتا ہے، اس میں کوئی چیز حرام نہیں پاتا سوائے اس کے کہ مردار یا بہتا ہوا خون یا خنزیر یا گوشت اس لئے کہ وہ ناپاک ہے یا فسق ہو یعنی وہ جانور جس پر ذبح کرتے ہوئے غیر اللہ کا نام پکارا جائے۔لیکن اگر کوئی مجبور ہو جائے اور وہ حد سے نہ بڑھے اور زیادتی نہ کرے تو تمہارا رب بڑا معاف کرنے والا ہے‘‘۔

مندرجہ بالا آیت میں وہ چیزیں حرام قرار دی گئی جنہیں اہل عرب عام طور پر حلال سمجھتے تھے۔

غیر مسلموں کی تیار کردہ غذائی اشیاء جس میں کسی قسم کی کوئی حرام شئی شامل نہ ہو، کا استعمال کرنا حلال ہے۔اور ان اشیاء کے استعمال کرنے میں کسی زمان یا مکان کی کوئی قید یا حد مقرر نہیں ہے۔حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ:

’’اتی النبی ﷺ بجبنة فی تبوك فدعا بسكين فسمی وقطع‘‘(۲)

’’آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں غزوہ تبوک کے موقع پر ایک پنیر کی ٹکیہ لائی گئی۔آپ ﷺ نے چھری منگوائی اور بسم اللہ پڑھ کر اس کو کاٹا (اور تناول فرمایا)

واضح رہے کہ پنیر حجاز میں تیار نہیں ہوتی تھی بلکہ شام وغیرہ سے آتی تھی۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مغفل فرماتے ہیں کہ:

’’كنا محاصرين قصر خيبر،فرمی انسان بجراب فيه شحم،فنزوت لآخذه،فالتفت فاذا النبی ﷺ فاستحييت منه‘‘(۳)

''ہم نے خیبر کے ایک قلعے کا محاصرہ کیا ہوا تھا، ایک آدمی نے چربی سے بھرا ہوا ایک چمڑے کا تھیلا پھینکا، پس میں اس پر جھپٹا کہ اسے اٹھالوں، لیکن مڑ کر دیکھا تو آپ ﷺ وہیں موجود تھے میں آپ ﷺ کو دیکھ کر شرما گیا''۔

اس حدیث کے ذیل میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہود کے ذبح کئے ہوئے جانور کی چربی کا استعمال کرنا مسلمانوں کے لئے جائز ہے۔ مالکیہ اور حنابلی میں سے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ چونکہ چربی یہود کے لئے حرام تھی اس لئے ان کے ذبیحہ سے نکلی ہوئی چربی بھی ہمارے لئے حرام ہوگی۔ لیکن امام مالک، اما ابوحنیفہ اور امام شافعی اور جمہور علماء اس کے جواز کے قائل ہیں۔ (۴)

۲۔ برتن کا استعمال:

غیر مسلم چونکہ اپنے برتنوں میں شراب اور خنزیر کا گوشت اور اس کے علاوہ حرام اشیاء کا استعمال کرتے ہیں اس لئے ان کے اس برتن کا استعمال کرنا مسلمانوں کے لئے جائز نہیں ہے۔ لیکن آپ ﷺ نے غیر مسلموں کے برتنوں کے استعمال کی اجازت ایک شرط کے ساتھ دی ہے۔ حضرت ابوثعلبہ خشنی بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ہم لوگ ایسے علاقے میں رہتے ہیں جہاں اہل کتاب ہیں کیا ہم ان کے برتن کھانے کے لئے استعمال کرسکتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''فان وجدتم غیر ھافلا تاکلوا فیھا، فان لم تجدوا فاغسلوھا، وکلوا فیھا'' (۵)

''پس اگر تمہیں ان برتنوں کے علاوہ اور برتن دستیاب ہوں تو ان کے برتنوں میں نہ کھاؤ، لیکن اگر دستیاب نہ ہوں تو انہیں دھولو پھر ان میں کھاؤ''۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب یا غیر مسلموں کے برتن کا استعمال دھونے سے قبل مکروہ ہے اور دھو کر ان کے برتن کو استعمال کرنا جائز ہے۔

۳۔ اہل کتاب کا ذبیحہ:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اَلۡیَوۡمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَ طَعَامُ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمۡ وَ طَعَامُکُمۡ حِلٌّ لَّہُمۡ'' (۶)

ترجمہ: ''آج تمہارے لئے تمام پاک چیزیں حلال کردی گئی ہیں اور ان لوگوں کا کھانا بھی تمہارے لئے حلال ہے جن کو کتاب

دی گئی اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما مذکورہ آیت کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

''طعامھم:ذبائحھم''(۷)'' آیت میں طعامھم سے مراد اہل کتاب کے ذبیحہ ہیں''۔

۴۔پانی کا استعمال:

اسلامی نقطہ نظر کے مطابق پانی اپنے اصل کے اعتبار سے پاک ہے وہ کسی کے ہاتھ لگانے یا کسی کی ملکیت میں آنے سے ناپاک نہیں ہوتا۔ پانی اس وقت ناپاک ہوتا ہے جب اس میں کوئی ناپاک چیز یا نجس چیز مل جائے۔ آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے غیر مسلموں کا پانی، کھانے پینے اور عبادات کے لئے استعمال کیا کرتے تھے۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ ایک سفر کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ

جس میں ایک غیر مسلم عورت پانی سے لینا ثابت ہے۔(۸)

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے ایک سفر میں ایک دفعہ ایک نصرانی عورت کے گھر سے گرم پانی لے کر وضو فرمایا تھا:

''وتوضأ عمرُ بالحميم من بيت نصرانية''(۹)

عصر حاضر میں غیر مسلموں سے سماجی تعلقات:۔

ا۔سلام کرنا:

آپس میں ملاقات کے وقت شریعت مطہرہ نے دو مسلمانوں کو سلام کرنے کی تعلیم دی ہے اور اس پر ان کو اجر کی نوید بھی سنائی ہے۔ البتہ غیر مسلم کو سلام کرنے کے حوالے سے اختلاف پایا جاتا ہے۔ آپ ﷺ کے دور میں یہود سلام کے لفظ کا تلفظ غلط استعمال کرتے ہوئے لفظ''سام'' کا استعمال کیا کرتے تھے۔ جس کا مطلب تھا''موت''۔ تو آپ ﷺ ان کے جواب میں صرف''وعلیکم'' فرمایا کرتے تھے اور آپ ﷺ کا یہ جواب دینا یہود کی شرارت ہی کی بناء پر تھا۔

سلام کے حوالے سے زیادہ تر علماء کی رائے یہ ہے کہ اس کا تعلق صرف مسلمانوں کے ساتھ ہے اس لئے غیر مسلم کو سلام نہیں کیا جا سکتا لیکن الفاظ، حالت کے مطابق استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ جبکہ کابر علماء میں سے بعض کے نزدیک سلام ایک طرح کی دعا ہے لہذا غیر مسلم کو بھی دی جا سکتی ہے۔ اس بات کو بنیاد بنا کر آج کے دور میں اگر کسی غیر مسلم کو سلام کر لیا جائے تو اس کے

اثرات تبلیغ دین پر اچھے مرتب ہو سکتے ہیں۔حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک ذمی کو خط لکھا۔اس پر بعض لوگوں نے کہا کہ آپ خط میں غیر مسلم کوسلام لکھ رہے ہیں انہوں نے جواب دیا:

''انه كتب الى فسلم على فرددت عليه''(۱۰)''

کہ اس نے مجھے خط میں سلام لکھا تھا میں نے اس کا جواب دیا ہے''۔

البتہ غیر مسلموں کے لئے سلام کے علاوہ ''السلام علی من اتبع الھدیٰ'' کے الفاظ کا آپ ﷺ کے خطوط میں ذکر ملتا ہے۔آپ ﷺ نے روم کے بادشاہ ہرقل کو جو خط لکھا تھا اس کے الفاظ یہ تھے:

''بسم الله الرحمٰن الرحيم من محمد عبد الله ورسوله الى هرقل عظيم الروم، السلام على من اتبع الهدىٰ اما بعد''(۱۱)

۲۔چھینک کا جواب دینا:

اسلامی تعلیمات کے مطابق اگر کسی مسلمان کو چھینک آئے تو اس کو چاہئے کہ وہ ''الحمد للہ'' کہے اور سننے والا اس کے جواب میں ''یرحمک اللہ'' کہے۔جیسا کہ حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''قال اذا عطس احدكم فليقل الحمد لله فاذا قال الحمد لله فليقل له اخوه او صاحبه يرحمك الله وليقل هو يهديكم الله ويصلح بالكم''(۱۲)

''جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو ''الحمد للہ'' کہے جب وہ الحمد للہ کہے تو اس کے بھائی یا اس کا ساتھی (جواب میں) ''يرحمك لله'' کہے،اور پھر چھینکیں والا ''يهديكم الله ويصلح بالكم'' (اللہ تم کو ہدایت دے اور تمہارا حال درست فرمائے) کہے''۔

البتہ غیر مسلم اس حکم سے مستثناء ہیں یعنی اگر وہ چھینکے تو اس سلسلے میں تعلیم یہ ہے کہ ان کے جواب میں ''یرحمک اللہ'' کے بجائے ''يهديكم الله ويصلح بالكم'' کہا جائے۔جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ:

''اليهود يتعاطسون عند النبى ﷺ رجاءً ان يقول لهم يرحمك الله فكان يقول يهديكم الله ويصلح بالكم''(۱۳)

یہود آپ کی مجلس میں زبردستی چھینکتے تھے (تا کہ آپ ﷺ اپنی عادت کے مطابق چھینکنے والے کے الحمد للہ کو سن کر جواب

میں)اس امید کے ساتھ کے آپ ان کے لئے ”یرحمک اللہ “فرمائیں گے لیکن آپ ان کے جواب میں ”یھدیکم اللہ ویصلح بالکم “فرماتے تھے۔

۳۔مریض کی عیادت کرنا:

بیمار کی عیادت کرنا بھی معاشرتی حقوق میں شامل ہے۔جس کی اہمیت آج کے دور میں بہت بڑھ گئی ہے۔غیر مسلموں کو اسلامی تعلیمات اور غیر خواہی کے جذبہ کو اجاگر کرنے کے لئے آپ ﷺ سے غیر مسلموں کے مریضوں کی عیادت کرنا ثابت ہے۔

جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا آپ ﷺ کی خدمت کرتا تھا جب وہ بیمار ہوا:

”فاتاہ النبی ﷺ یعودہ فقعد عند رأسہ فقال لہ اسلم فنظر الی ابیہ وھو عندہ فقال اطع ابا القاسم فاسلم“(۱۴)

”آپ ﷺ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے۔اور اس کے سرہانے بیٹھ گئے اور اس کو اسلام کی دعوت دی۔اس لڑکے نے اپنے باپ کو دیکھا جو کہ اس کے قریب ہی بیٹھا تھا(گویا کہ وہ اپنے والد کی رضامندی دریافت کر رہا تھا) تو اس کے باپ نے کہا کہ ابا القاسم کی بات مان لو پس وہ لڑکا ایمان لے آیا“۔

۴۔غیر مسلموں کے ساتھ نکاح:

اسلام نے مشرکین کے ساتھ نکاح کے معاملات اختیار کرنے کی ممانعت فرمائی ہے:قرآن مجید میں ارشاد باری تعالی ہے:

”ولاتنکحواالمشرکات حتی یؤمن“(۱۵)

”مشرکین کی عورتوں سے نکاح مت کرو“۔

یہ ممانعت ہمیشہ کے لیے ہے، کیونکہ توحید اور شرک ایک دوسرے کے بالکل متضاد ہیں۔البتہ اہل کتاب اور مسلمانوں میں چونکہ بہت سارے عقائد اور اعمال میں اشتراک پایا جاتا ہے اس لئے ان سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔ارشاد باری تعالی ہے:

”وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ“(۱۶)

”تمہارے لئے حلال ہیں اہل ایمان کی پاکدامن عورتیں اور ان لوگوں کی پاک دامن عورتیں جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے“۔

مذکورہ آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ پاکدامن اور شریف اہل کتاب عورت سے بھی نکاح جائز ہے۔

کتابیہ عورت سے نکاح کا جواز کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر دور کے لئے ہے ۔
بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کتابیہ عورت سے نکاح پر برہمی کا اظہار فرمایا تھا جو کہ مصلحت کی بناء پر تھا ورنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک نص قطعی سے ثابت شدہ عمل کی کیسے مخالفت کرتے، روایت میں ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک یہودیہ عورت سے شادی کی تو انہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ وہ اس عورت کو طلاق دے دیں۔اس کے جواب میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا کہ اگر آپ اسے حرام سمجھتے ہیں تو میں اسے ابھی چھوڑ دیتا ہوں۔اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا کہ:

"لا ازعم انها حرام ولكن اخاف ان تعاطوا المومسات منهن"(١٧)

"میں نہیں کہتا کہ وہ حرام ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم ان کی بدکار عورتوں سے نکاح کرنے نہ لگ جاؤ"۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اگرچہ اہل کتاب کی پاکدامن اور عفیف عورتوں سے نکاح کو جائز سمجھتے تھے۔لیکن اخلاقی گراوٹ اور بے راہ روی کے خدشے کی وجہ سے اس نکاح کو ناپسند کیا۔
اس اصول کے پیش نظر دورِ جدید میں بھی اہل کتاب سے نکاح کی صورت میں بنیادی شرط ان کی عفت، پاک دامنی اور کتاب پر عمل ہوگی۔

۵۔غیر مسلموں کی تعلیمات اور ضابطہ نبوی ﷺ:

غیر مسلموں کی تعلیمات کے بارے میں آپ ﷺ نے ایک واضح موقف اختیار فرمایا! تاکہ کمزور عقائد والے مسلمانوں کے ایمان یا اسلامی تعلیمات میں تحریفات اثر انداز نہ ہو جائیں۔جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پاس تشریف لائے اور عرض کیا کہ:

"انا نسمع احاديث من يهود تعجبنا افترىٰ ان نكتب بعضها،فقال امتهوكون انتم كما تهوكت اليهود والنصرى لقد جئتكم بها بيضاء نقية ولو كان موسى حيا ماوسعه الا اتباعیٰ"(١٨)

ہم یہود سے ایسی باتیں سنتے ہیں جو بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں تو کیا ہم انہیں لکھ لیا کریں۔آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم ان یہود و نصاریٰ کی طرح حیران و سرگرداں ہو، حالانکہ میں تمہارے پاس بالکل واضح صاف ستھری شریعت لے کر آیا ہوں اور

اگر موسیٰ علیہ السلام بھی میرے دور میں زندہ ہوتے تو انھیں بھی میری اتباع کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا''۔

غیر مسلموں کی تعلیمات کے متعلق آپ ﷺ نے ایک اور ضابطہ یہ بھی بیان کیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ اہل کتاب عبرانی زبان میں تورات پڑھتے اور ہمارے سامنے اس کی تفسیر عربی زبان میں کرتے (اس پر) آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان کی نہ تصدیق کرو اور نہ ہی تکذیب کرو بلکہ یہ کہا کرو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو کچھ اس نے ہمارے اوپر نازل کیا اس پر ایمان لائے اور جو کچھ تمہارے اوپر نازل کیا اس پر ایمان لائے''۔

امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ اس حدیث کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''فالتوراة من الله تعالى وتفسيرها من افعال العباد''(١٩)

''تورات تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے البتہ اس کی تفسیر افعال عباد میں سے ہے''۔

یہ تو ان معاملات کے بارے میں ہے جو دینی مسائل یا تعلیمات ہیں۔ البتہ دنیاوی تعلیم میں جو تعلیم عقائد اور ایمان کے تقاضوں کے خلاف نہ ہو ان کے سیکھنے میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

٦ جنازہ اور تعزیت میں شرکت:

انسانی ہمدردی کا اظہار ایک سماجی تقاضا ہے اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے۔ اس لیے ان کے غم میں شمولیت بحیثیت انسان جائز ہے، جیسا کہ سنت نبوی ﷺ ہے کہ جب کوئی جنازہ گزرے تو کھڑے ہو جانا چاہیے، اگر یہ جنازہ غیر مسلم کا بھی ہو تو بھی یہی حکم ہے۔ ایک مرتبہ ایک یہودی سردار کا جنازہ گزرا تو آپ ﷺ احتراماً کھڑے ہو گئے حدیث شریف میں ہے کہ:

''عن جابر بن عبد الله قال مر بنا جنازة فقام لها النبى ﷺ وقمنا فقلنا يارسول الله انها جنازة يهودى قال اذا رأيتم الجنازة فقوموا''(٢٠)

''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہمارے سامنے سے جنازہ گزرا تو آپ ﷺ کھڑے ہو گئے اور ہم بھی آپ کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ ہم نے کہا کہ یا رسول اللہ یہ جنازہ تو یہودی کا ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب بھی تم جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جایا کرو''۔

٧۔ غیر مسلموں پر انفاق:

ابتدائے اسلام میں ہر طرف دین کی مخالفت اور اس کے پیروکاروں پر تشدد کا سلسلہ عروج پر تھا اور بہت سے مسلمان

خود حاجت مند تھے اس لئے آپ ﷺ نے مسلمانوں پر صدقہ وخیرات کی تلقین کر دی تھی۔تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

''لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِیْ مَنْ يَّشَآءُ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ''(۲۱)

''اے پیغمبر! آپ پر ان کو ہدایت بخش دینے کی ذمہ داری نہیں ہے۔البتہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے تم جو مال بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے اس کا فائدہ تم ہی کو پہنچے گا۔تم اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرتے ہو۔اس کا پورا بدلہ تمہیں دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی نہ ہوگی''۔

اس آیت کے سببِ نزول کے بارے میں متعدد روایات ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ یہاں غیر مسلموں پر انفاق کی تلقین کی گئی ہے۔

''عن ابن عباس عن النبی ﷺ:انہ کان یأمر بالا تصدق الا علی اھل الاسلام،حتی نزلت ھذہ الآیۃ''(۲۲)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ آپ ﷺ کی ہدایت تھی کہ مسلمان جو کچھ صدقہ وخیرات کریں وہ مسلمانوں ہی پر کریں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ذمیوں مین جو حاجت مند ہوتے تو مسلمان ان پر خرچ کیا کرتے تھے جب مسلمانوں ہی میں حاجت مندوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''لا تتصدقوا الا علی اھل دینکم''(۲۳)''

اپنے ہم مذہب لوگوں ہی پر تم لوگ صدقہ وخیرات کرو''۔

کاروباری تعلقات:

اسلام ان چیزوں کی پیداوار اور لین دین کو حرام قرار دیتا ہے جن کو شریعت نے حرام کہا ہے۔اور اس سلسلے میں کسی قسم کے تعاون کو بھی روا رکھنے کو جائز نہیں سمجھتا۔ناجائز اور حرام چیزوں کے کاروبار میں تعاون کو وہ معصیت اور عدوان کے مترادف قرار دیتا ہے۔البتہ حلال اشیاء کی تجارت اور خرید وفروخت کے معاملے کو اسلام جائز قرار دیتا ہے۔آپ ﷺ کا کاروباری لین دین غیر مسلموں کے ساتھ ثابت ہے جیسا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ:

''کنا مع النبی ﷺ،ثم جاء رجل مشرك مشعان طویل بغنم یسوقھا،فقال النبی

ﷺ:بیعا ام عطیة۔او قال ام ھبة۔فقال:لا بیع۔فاشتریٰ منه شاة"(۲۴)

"ہم آپ ﷺ کی خدمت میں موجود تھے ایک مشرک پراگندہ بالوں اور لمبے قد والا تھا کچھ بکریاں لے کر آیا۔آپ ﷺ نے سوال کیا کیا یہ فروخت کرنے کے لئے ہیں یا بطور تحفہ ہیں؟اس نے کہا فروخت کرنے کے لئے ہیں۔آپ ﷺ نے اس سے ایک بکری خریدی"۔اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غیر مسلموں کے ساتھ حلال اشیاء کی خرید وفروخت جائز ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی حیات طیبہ کے آخری دور کے حوالے سے یوں بیان فرماتی ہیں کہ:

"توفی رسول اللہ ﷺودرعه مرھونة عند یھودیة بثلاثین صاعامن شعیر"(۲۵)

"آپ ﷺ کی وفات اس حال میں ہوئی کہ آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس صاع جو کے بدلے میں رہن رکھی ہوئی تھی"۔

جمہور علماء کے نزدیک غیر مسلموں کے ساتھ کاروبار میں شرکت بھی جائز ہے۔بشرطیکہ مسلمان کا دینی لحاظ سے بھی کوئی نقصان نہ ہو اور مسلمانوں کی طاقت وقوت بھی اس سے متاثر نہ ہوتی ہو۔اور کاروبار میں شریعت کے مقرر کردہ اصولوں کا خیال رکھا گیا ہو۔اس کی دلیل حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ:

"اعطی رسول اللہ ﷺخیبر الیھود ان یعملوھا ویزرعوھا،ولھم شطر ما یخرج منھا"(۲۶)

"آپ ﷺ نے خیبر (کی فتح کے بعد) یہود کو اس شرط پر مقبوضہ زمین پر کاشت کی اجازت دی کہ انہیں پیداوار کا نصف ملے گا"۔

اور دیگر احادیث سے غیر مسلموں کی نوکری یا خدمت کرکے مال حاصل کرنے کا جواز بھی ثابت ہے۔حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ پر فاقہ کی کیفیت تھی۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ملی تو وہ کسی کام کی تلاش میں نکلے تا کہ آمدنی سے آپ کے لئے کھانے کا سامان کرسکیں۔ایک یہودی کے باغ میں پہنچے اس کی سنچائی کی۔سترہ ڈول کھینچے اور ہر ڈول پر ایک عمدہ کھجور ملی اسے لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔(۲۷)

مذکورہ حقائق سے یہ بات وضح ہوتی ہے کہ مسلم اور غیر مسلم آپس میں خیر خواہی پر مبنی تعلقات ہر دور میں رکھ سکتے ہیں۔ موجودہ دور میں چونکہ دنیا ایک گلوبل ولیج کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ لہذا اسلام کی ابدی تعلیمات ان تعلقات کی راہ میں خلیج پیدا کرنے کی بجائے ان میں تعاون اور اشتراک کی بنیادیں فراہم کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ تاہم اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ عقائد اور معاملات میں شریعت کے اصولوں سے سرِ موانحراف نہ کیا جائے۔

مراجع وحواشی:

۱۔ سورۃ الانعام: آیت ۱۴۱۵

۲۔ سجستانی، سلیمان بن اشعث، سنن ابی داؤد، ج:۵، ص:۶۳۶، دارلرسالۃ العالمیۃ، ۱۴۳۰ھ، ۲۰۰۹۔

۳۔ امام بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح البخاری، ص:۱۴۰۳، دارابن کثیر، دمشق، بیروت ۱۴۳۲۱ھ، ۲۰۰۲ء۔

۴۔ نووی، شرح مسلم، ج:۴، ص:۱۰۲، ۱۰۳ دارریان التراث، قاہرہ، ۱۴۰۷ھ۔

۵۔ الجامع الصحیح البخاری، محولہ بالا، ص ۱۳۹۵.

۶۔ سورۃ المائدہ: آیت ۵۔

۷۔ الجامع الصحیح البخاری، محولہ بالا، ص ۱۴۰۳۔

۸۔ ایضا۔ ص:۱۴۰۱۔

۹۔ ایضا، ص:۶۰۔

۱۰۔ امام بخاری، محمد بن اسماعیل، الادب المفرد، ص:۲۸۳ لمطبعۃ السلفیۃ، قاہرہ، ۱۳۷۵ھ۔

۱۱۔ الجامع الصحیح البخاری، ص:۱۵۶۳۔

۱۲۔ امام بخاری، محمد بن اسماعیل، الادب المفرد، ج:۲، ص:۵۷۰ مکتبۃ المعارف للنشر، ریاض، ۱۹۶۱۔

۱۳۔ ایضا، ج:۲، ص:۵۱۱۔

۱۴۔ امام بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح البخاری، ج:۱، ص:۱۸۱، مکتبۃ المعارف للنشر، ریاض، ۱۹۶۱۔

۱۵۔ سورۃ البقرۃ: آیت ۱۲۲۔

۱۶۔ سورۃ المائدہ: آیت ۵۔

۱۷۔ قرطبی، محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، ج:۳، ص:۵۴۷، مکتبہ مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۴۲۷ھ، ۲۰۰۶ء۔

۱۸۔ امام بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح البخاری، ج:۲، ص ۱۱۲۵، مکتبۃ المعارف للنشر، ریاض، ۱۹۶۱۔

۱۹۔ کشمیری، مولانا انور شاہ، فیض الباری، ج:۴، ص:۵۳۶، المکتبۃ العزیزیہ، لاہور، ۱۳۴۷ھ۔

۲۰۔ الجامع الصحیح البخاری، ج:۱، ص:۱۷۵، مکتبۃ المعارف للنشر، ریاض، ۱۹۶۱۔۔

۲۱۔ سورۃ البقرہ: آیت۲۷۲۔
۲۲۔ ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، تفسیر ابن کثیر، ج:۱،ص:۷۰۴، دار طیبہ، ۱۴۲۰ھ، ۱۹۹۹ء۔
۲۳۔ الجامع لاحکام القرآن، ج:۳،ص:۳۳۷۔
۲۴۔ الجامع الصحیح البخاری، ص:۵۳۸، دار ابن کثیر، دمشق، بیروت ۱۴۳۲ھ، ۲۰۰۲ء۔
۲۵۔ ایضا،ص:۲۰۷۔
۲۶۔ ایضا،ص:۶۰۶۔
۲۷۔ ابن ماجہ، محمد بن یزید، ابن ماجہ، الکتب الستہ، ج:۲،ص ۱۸۹، دار السلام للنشر والتوزیع، ریاض، ۱۴۲۹ھ۔